طلوع اسلام

جون ۱۹۵۲

10

صحیح انتخاب اس وقت ہوسکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کے لئے قسم قسم کا مال موجود ہو، اور

خریداری کا فیصلہ

اس وقت ہوسکتا ہے جب آپ تسلی کرلیں کہ قیمت واجبی ہے۔ اور

آپ کا اطمینان

اسوقت ہوسکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا مال ویسا ہی نکلا۔

آپ یونہی پریشان نہ ہوجئے

ہمارے ہاں آئیے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔

ہمارے ہاں ہر قسم کا ہوزری کا سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے	سمرسیٹ سٹریٹ، کراچی
پرچون کے لئے	الفنسٹن سٹریٹ، کراچی

تشریف لائیے

نیازآگین: ایچ غلام محمد اینڈ برادرز، کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدل اشتراک	مُرتّب	قیمت فی پرچہ
سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی) " غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ	محمد یونس	دس آنے (پاکستانی) بارہ آنے (ہندوستانی)

جلد ۵	جون ۱۹۵۲ء	نمبر ۶

فہرستِ مضامین

لمعات	۴ - ۱۰	غلام اور لونڈیاں	۴۳ - ۶۱
بقیہ لمعات	۶۳	شرک	۶۴ - ۶۶
ضرب الکلیم (پرویز صاحب)	۱۱ - ۱۵	نوحۂ انگلیس (نظم) (اسد ملتانی صاحب)	۶۷ - ۶۸
یتیم پوتے کی وراثت	۱۶ - ۲۷	نقد و نظر	۶۹ - ۷۰
روزے کے احکام	۲۷		
محجوب الارث (علامہ اسلم صاحب مدظلہ)	۲۸ - ۴۲		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کچھ عرصہ سے کراچی کے اخبارات میں، قریب قریب ہر روز، خودکشی کے کسی نہ کسی واقعہ کی خبر درج ہوتی ہے۔ (غالباً دوسرے شہروں میں بھی ایسے واقعات رونما ہوتے ہوں گے لیکن کراچی کے اخبارات میں بالعموم مقامی واقعات ہی کا ذکر ہوتا ہے)۔ جس تیز رفتاری سے یہ واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں اور جن مہیب، دردناک، روح فرسا، وحشت انگیز اور جگر پاش داستانوں کے خونچکاں کفن میں لپٹے ہوئے یہ حوادث منظرِ عام پر آتے ہیں، ان کے تصور سے ہر قلبِ حساس طلسمِ پیچ و تاب، اور ہر چشمِ عبرت جوئبار فشاں ہے۔ ابھی ایک واقعہ کی دردانگیز یاد شعور سے تحت الشعور میں جانے نہیں پاتی کہ اس سے زیادہ جگر سوز واقعہ اور سامنے آ جاتا ہے، سنجیدہ حلقے ان واقعات سے کافی متوحش اور پریشاں خاطر نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف مفاد پرست طبقے ان واقعات کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے بطور آلۂ کار استعمال کرتے ہیں۔ جو جماعتیں، حکومت کی کرسیوں پر خود متمکن ہونا چاہتی ہیں انھیں ان واقعات میں حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا کافی مسالہ مل جاتا ہے۔ کمیونسٹ انھیں نظامِ سرمایہ داری کا لازمی نتیجہ قرار دیکر ان سے اشتراکیت کی صداقت کی دلیل لاتا ہے۔ مولوی، خودکشی کو جرمِ عظیم قرار دیکر مرنے والے کو جہنم رسید کر دیتا ہے اور اس کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں نے اپنا فریضۂ دینی ادا کر دیا۔ اعصابی اور دماغی امراض کے ماہرین، انھیں عصبی کمزوری بتا کر اپنا اطمینان کر لیتے ہیں کہ تشخیص بالکل صحیح ہو گئی۔ پولیس، ان بخت جانوں کو جو اس اقدام کے باوجود نہیں مر پاتے، عدالت میں لے جا کر سزا دلا دیتی ہے اور مطمئن ہو جاتی ہے کہ ان کا فریضہ بھی ادا ہو گیا۔۔۔ اخبارات ان "سنسنی خیز" خبروں کو چھاپ کر گرمیٔ بازار کا سامان فراہم کر لیتے ہیں۔ کارکنانِ حکومت ان اعداد و شمار کو جمع کرتے رہتے ہیں تاکہ سالانہ رپورٹ مرتب کرنے میں امداد ملے۔ مرنے والا قبر میں چلا جاتا ہے اور اس کے پس ماندگان جیتے جی جہنم میں۔۔۔ بس یہ ہوتا ہے انجام ایک واقعۂ خودکشی کا۔ فضا اس سے اس وقت تک مرتعش رہتی ہے جب تک دوسرا واقعہ سامنے نہیں آتا۔ جب دوسرا سامنے آ جاتا ہے تو گویا پہلے واقعہ سے متعلق تمام اعمال و ظروف، اسباب و علل، انجام و عواقب، سب خود بخود یکسو ہو جاتے ہیں۔

ان واقعات کے اسباب و علل کا تجزیہ کیا جائے تو بیشتر حصہ مفلسی اور ناداری، تہی دامنی اور بیکاری کا نتیجہ دکھائی دے گا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ایک نوجوان تلاشِ معاش میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن اسے کہیں کام نہ مل سکا۔ اس نے ہر چند کوشش کی کہ اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کہیں سے کچھ مل جائے، لیکن وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہا۔ اس انتہائی مایوسی اور

کس مپرسی کے عالم میں اس نے اپنا خاتمہ کرلیا۔

اسی طرح ناداری اور بیکاری کے ساتھ بیماری ہے۔ کئی واقعات ایسے سامنے آئے کہ ایک شخص مدت سے بیمار چلا آرہا ہے۔ علاج تو ایک طرف، کھانے تک کے لئے پیسہ پاس نہیں۔ ... بیماری نے کام کاج کے بھی قابل نہیں رکھا۔ ہسپتال والوں نے اپنے ہاں داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ ان حالات میں اس نے یہی سوچا کہ اس زندگی سے موت بہتر۔ اٹھا اور چوتھی منزل سے کود کر جان دیدی۔

کچھ واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جن میں گھروں کے مناقشات خودکشی کا موجب بن جاتے ہیں۔ ساس بہو کی مستقل لڑائی (جو ہمارے معاشرے کا گویا فطری جزو بن چکی ہے) ماں بیٹے کے کشیدہ تعلقات۔ رشتہ داروں کی مخاصمت۔ میاں بیوی کے جھگڑے۔ ان میں نہ صرف خودکشی کے واقعات ہی رونما ہوتے ہیں بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ غصے کی دیوانگی میں بچے کو اٹھا کر دیوار پر مار دیا اور وہ پاش پاش ہو کر آغشتہ خاک وخون ہو گیا۔

بعض واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں دنیا "ناکامی محبت" کی اصطلاح سے تعبیر کرتی ہے لیکن درحقیقت ان کا تعلق بھی بیشتر، رشتہ داروں کی باہمی کشیدگی تعلقات ہی سے ہوتا ہے۔ لڑکا ایک جگہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ماں باپ نہیں مانتے۔ یتیم بالغ لڑکی اپنے خاوند کے انتخاب میں اپنی رائے رکھتی ہے لیکن اس کا بھائی اسے کہیں اور فروخت کرنا چاہتا ہے۔

وقس علیٰ ہذا

خودکشی کے یہ کثیر التعداد واقعات درحقیقت اس جنون اور دیوانگی کے آثار ہیں جو اس وقت قوم کے دماغوں پر مسلط ہوتا جارہا ہے۔ اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے کسی تحقیقاتی کمیٹی کے تعین کی ضرورت نہیں۔ بات بالکل کھلی ہوئی اور واضح ہے۔ تقسیم ہند کے ساتھ مسلمانوں پر جو قیامت گذری تھی وہ کسی قوم کے دماغی توازن کو کھو دینے کے لئے کم نہ تھی۔ لیکن اس ہولناک مرحلے سے قوم آگے نکل آئی محض اس امید کے سہارے کہ

وہ آئی — لے وہ آئی — دلِ ناصبور صبح!

پاکستان، ان کے خوابوں کی تعبیر۔ ان کی آرزوؤں کا گہوارہ۔ ان کی امیدوں کا سہارا۔ ان کے مستقبل کی خوش حالیوں کا ضامن اور ان کی زندگی کی خوشگواریوں کا کفیل نظر آتا تھا۔ قوم اس صبحِ درخشاں کی امید کے سہارے، شب تیرہ وتار کی بھیانک ظلمتوں سے آگے نکل آئی۔ لیکن یہاں کی پانچ سالہ زندگی نے ان کی تمام امیدوں کو ایک ایک کرکے توڑ ڈالا۔ انھوں نے اپنے ذہن میں جو نقشے قائم کر رکھے تھے وہ ایک ایک کرکے غلط ثابت ہوگئے۔ انھوں نے یہ تو دیکھ لیا کہ وہ رات کی تاریکیوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ افقِ پاکستان سے جو صبح نمودار ہوئی ہے، وہ کسی امید کی کرن کو اپنے ساتھ نہیں لائی۔ انھوں نے اس صبح کو دیکھا اور بصد حسرت ویاس پکار اٹھے کہ

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر — وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

تقسیم ہند کی بے پناہ مصیبتوں نے بدن سے قوتِ مدافعت سلب کر لی تھی۔ اس پنج سالہ یاس و ناامیدی نے ان کے اعصاب کے ایک ایک تار کو توڑ ڈالا۔ جن کے اعصاب میں کچھ سکت باقی ہے وہ اپنے لئے موہوم امیدیں پیدا کر کے زندگی کے دن پورے کر لیتے ہیں۔ جن میں اتنی سی سکت بھی باقی نہیں رہتی وہ اپنے ہاتھوں اپنا گلا کاٹ لیتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے دماغی توازن کا بگاڑ ابھر کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ ورنہ اسوقت حقیقت یہ ہو چکی ہے کہ قوم کا بیشتر حصہ اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے کسی میں بات سننے کی تاب نہیں رہی۔ کسی میں برداشت کی قوت نہیں اور غور و فکر کی صلاحیت تو قریب قریب معدوم ہو چکی ہے۔ لیکن ہم نے جس مقصد کے پیشِ نظر اس بات کو چھیڑا ہے وہ یہ نہیں وہ مقصد اس سے الگ ہے۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ کیا یہ واقعات صرف اتنی ہی حیثیت اور اہمیت رکھتے ہیں کہ اخبارات میں بطور "خبر" چھاپ دیا کریں۔ پولیس والے مردہ کا پوسٹ مارٹم اور زندہ بچ رہنے والے کا چالان کر دیا کریں۔ ہم آپ ان خبروں کو پڑھکر اخبار ایکطرف پھینک دیا کریں گویا یہ قطب شمالی کی مچھلیوں کا کوئی واقعہ تھا۔ جس سے ہمارا واسطہ اتنا ہی تھا کہ یہ کسی مقام کی خبر (NEWS) تھی یا نہیں حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا ذریعہ بنا لیا جائے یا حکومت کے دفاتر میں اپنی "سالانہ رپورٹ" کے لئے بطور (MATERIAL) سنبھال کر رکھ لیا جائے!

کیا یہ واقعات فی الحقیقت اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں؟ کیا ان مرنے والوں کی موت سے خود ہماری موت و حیات کے مسئلے کا کوئی تعلق نہیں؟ کیا ان کے پس ماندگان کی بیکسی اور بے بسی سے ہماری ذلت و رسوائی کا کوئی دامن وابستہ نہیں؟ کیا ان کے اعصاب کی کمزوری کا خود ہمارے اعصاب سے کوئی علاقہ نہیں؟ کیا ان اسباب و علل کا جن سے مجبور ہو کر یہ خودکشی کر لیتے ہیں ہمارے ماضی، حال اور مستقبل سے کچھ بھی تعلق نہیں؟ کیا یہ اپنی موت کے آپ ذمے دار ہیں، ہم پر اسکی کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی؟ کیا انکا دماغی خلل ان کا اپنا پیدا کردہ ہوتا ہے، اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا؟ کیا یہ اپنا گلا آپ گھونٹتے ہیں، ہمارے ہاتھ ان کے خون کے دھبوں سے دامنِ خضر کی طرح پاک و صاف ہوتے ہیں؟ کیا اقدام خودکشی کر کے زندہ بچ رہنے والا تنہا عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہونے کا سزاوار ہے، ہمارا کوئی جرم نہیں جس وجہ سے ہم بھی اس کے ساتھ وہاں کھڑے ہوں؟ کیا سب الزام اور جرم انہیں کا ہے، ہم سب اس باب میں بے گناہ اور معصوم ہیں؟

سوچئے کہ کہیں حقیقت یہ تو نہیں کہ اس جرم کا نام ہم نے "خودکشی" اس لئے رکھ چھوڑا ہے کہ اگر خود فریبی یا فریب دہی کا پردہ اٹھ جائے تو خودکشی کرنے والے کے اصل قاتل ہم ہی قرار پائیں؟ یعنی کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے جرم قتل کی سزا سے بچنے کے لئے اس کا نام خودکشی رکھ چھوڑا ہے تاکہ کسی کی نظر ہم پر نہ پڑے!

انسانوں کے خودساختہ قوانین اور ان قوانین کو نافذ کرنے والی عدالتیں ان سوالات کا جواب کچھ ہی کیوں نہ دیں کائنات کا وہ عالمگیر قانون جو آفاقی اور انسانی دونوں دنیاؤں کو محیط ہے، اس قسم کے حادثات کا مجرم اس معاشرہ کو قرار دیتا ہے جس میں خودکشی کرنے والا اپنے لئے زندگی اور اسکی خوشگواریوں کا کوئی سامان نہیں پاتا! خودکشی صرف انسانی معاشرے کے اندر ہی ممکن ہے۔ کوئی حیوان خودکشی نہیں کرتا۔ وہ خودکشی کر سکتا ہی نہیں یہ خصوصیت صرف انسانی تمدن کی ہے۔

انسانی زندگی تضادات سے بھرپور ہے۔ اس میں قدم قدم پر تصادم واقع ہوتے ہیں۔ انسان اور خارجی قوتوں میں تضاد۔ انسان اور انسان کے درمیان تضاد۔ اور خود انسان کے اپنے اندر تضاد۔ اس کا سینہ ہمہ قسم تضادات کی کشمکش اور تصادمات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ خارجی قوتوں سے مقابلہ کرنے میں انسان کبھی خودکشی نہیں کرتا وہ خودکشی اسوقت کرتا ہے جب وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مقابلہ کرنے میں عاجز آجاتا ہے۔ یا جب وہ اپنے سینے کی اندرونی کشمکش کے ہاتھوں لاچار ہو جاتا ہے۔ اگر آپ اس تیسری شق کو دیکھیں (یعنی انسان کی داخلی کشمکش) تو اس میں بھی آپ آخرالامر اس نتیجہ پر پہنچینگے کہ اس میں بے کسی اور لاچاری کی نوبت بھی اسوقت ہی آتی ہے جب انسانوں کی دنیا اسکا ساتھ نہیں دیتی۔ اس لئے خودکشی درحقیقت اس زندگی میں ہوتی ہے جہاں انسان کا واسطہ انسان سے پڑتا ہو۔

ہم نے ابھی ابھی کہا ہے کہ خارجی قوتوں کے ساتھ نبرد آزما ہوتے وقت انسان کبھی خودکشی نہیں کرتا۔ وہ خودکشی اسوقت کرتا ہے جب اس کا واسطہ انسانوں سے پڑے۔ ذرا غور کیجئے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کائنات کی خارجی قوتیں ایک لگے بندھے قانون کے تابع چل رہی ہیں۔ انہیں اس قانون کی زنجیر میں جکڑ دیا گیا ہے۔ (وسخر لکم ما فی السمٰوٰت والارض جمیعاً) جسوقت انسان اس قانون کا علم حاصل کر لیتا ہے یہ تمام قوتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتی ہیں (آدم، علم الاسماء سے مسجودِ ملائک بنتا ہے)۔ ان کے برعکس انسان کسی قانون کی اطاعت پر مجبور نہیں پیدا کیا گیا۔ وہ جس قسم کا قانون چاہے اپنے لئے وضع کرلے اور جب جی چاہے اس قانون کی اطاعت کرے، جب جی چاہے اس سے سرکشی برت لے۔

لیکن انسان معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور رہے۔ اور معاشرہ کی ترکیب اور قیام، قانون کے بغیر ناممکن ہے۔ کوئی سوسائٹی قانون کے بغیر قائم رہ ہی نہیں سکتی۔ معاشرہ کے قانون کون بناتا ہے؟ اربابِ اقتدار! انسان کی ساری تاریخ اس پر شاہد ہے۔ خواہ وہ شخصی حکومت کا مطلق العنان بادشاہ ہو اور خواہ جمہوری فریب کی مجالس آئین ساز۔ انسان کا خودساختہ قانون ہمیشہ اربابِ قوت و اقتدار کا وضع کردہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا اولیں منشاء و مقصود اقتدار کی حفاظت اور استحکام ہوتا ہے۔ اس معاشرہ میں فرد کا مقام بہ حیثیت فرد کچھ نہیں ہوتا۔ اس میں تمام اہمیتیں اور جملہ حیثیتیں اضافی (RELATIVE) ہوتی ہیں۔ ذاتی (INTRINSIC) نہیں ہوتیں اس میں آدمی (MAN) کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ کوئی فرد محض فرزندِ آدم (HUMAN BEING) ہونے کی جہت سے متعارف ہی نہیں ہوتا اس کے تعارف (INTRODUCTION) کے لئے کسی نہ کسی اضافی نسبت کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے ایسے معاشرہ میں جب تک افراد کی اضافی حیثیت قائم رہتی ہے وہ اپنے آپ کو زندگی اور اس کی خوشگواریوں کا مستحق سمجھتا اور ان کا مورد پاتا ہے۔ لیکن جسوقت یہ اضافی حیثیتیں ختم ہو جاتی ہیں معاشرے میں اسکی کوئی حیثیت اور کوئی مقام نہیں رہتا۔ نہ ہی معاشرے کو اس سے کوئی دلچسپی باقی رہتی ہے۔ یہ فرد بالکل تنہا رہ جاتا ہے اور بستی دنیا اور بھری محفل میں اپنے آپ کو اکیلا پاتا ہے۔ تنہائی کا احساس، انسان کو مار دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ انسان کے لئے سب سے زیادہ سنگین سزا، قیدِ تنہائی (SOLITARY CONFINEMENT) ہے۔ اس مقام پر انسان زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں پاتا۔ دنیا میں اس کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ بلکہ دنیا اس کیلئے تنہائی کا قیدخانہ بن جاتی ہے۔ تنہائی کا شدید احساس ہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر انسان خودکشی کر لیتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی خودکشی کرنے والا کسی کو اپنا رازدار نہیں بناتا۔ وہ اپنے اس ارادے میں کسی کو شریکِ راز نہیں کرتا۔ یہ اس لئے کہ

وہ خودکشی کا ارادہ ہی اسوقت کرتا ہے۔ جب وہ محسوس کرتا ہے کہ میں دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ جو انسان بھی یہ سمجھ لے کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے وہ زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ زندگی اسے کالی ناگن بنکر ڈستی ہے۔ یہی خودکشی کا مقام ہوتا ہے۔

اب آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ خودکشی کرنے والا خود مجرم ہوتا ہے یا مجرم ہوتا ہے وہ معاشرہ جو اسے یہ سمجھنے اور محسوس کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ میں بالکل اکیلا ہوں۔ میرا کوئی نہیں اگر معاشرہ اسے تنہا نہ چھوڑے تو وہ خودکشی نہ کرے۔ لیکن معاشرے کی اس سے دلچسپی اس وقت تک رہتی ہے جب تک معاشرہ اسے . . . . اپنے کسی مقصد کے لئے مفید سمجھتا ہے۔ جب معاشرے کا کام اس کے بغیر چلتا رہتا ہے تو معاشرے کو اتنا بھی یاد نہیں رہتا کہ ایسا کوئی فرد بھی کبھی موجود تھا۔

لہٰذا خودکشی پیدا کردہ ہے اس معاشرہ کی جس میں فرد کو تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے اور تنہا اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ معاشرہ سمجھتا ہے کہ میرا کام اس کے بغیر بھی چل سکتا ہے۔ یعنی اس معاشرہ میں فرد معاشرہ کے قیام کے لئے زندہ ہوتا ہے۔ معاشرہ، فرد کی حفاظت کے لئے قایم نہیں ہوتا۔

یہ ہے وہ معاشرہ جو انسانوں کے خود ساختہ قانون پر مبنی ہوتا ہے۔

ایک معاشرہ اور ہوتا ہے۔ اس معاشرہ کی بنیاد ہوتی ہے ایک ایسے قانون پر جو قانونِ کائنات کی طرح انسانوں کا خود ساختہ نہیں ہوتا بلکہ وہ وہیں سے ملتا ہے جہاں سے قانونِ کائنات ملتا ہے۔ اسے وحی کہتے ہیں (چنانچہ قرآن میں قانونِ کائنات کے لئے بھی وحی کا لفظ آیا ہے) اس قانون اور قانونِ کائنات میں فرق یہ ہے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) کائنات کا قانون از خود جاری و ساری ہے۔ لیکن انسانوں نے اس قانون کو اپنے اوپر خود نافذ کرنا ہوتا ہے۔ اس قانون کی اولیں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فرد کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے ہر فردِ آدم کے اندر اپنی "روح پھونکدی" ہے (ونفخنا فیہ من روحنا) یعنی ہر پیکرِ انسان اس روحِ خداوندی کا حامل ہے۔ خدا ایک ذات (PERSONALITY) ہے۔ اس لئے نفخ روحِ خداوندی' سے مفہوم یہ ہے کہ ہر انسان' انسان ہونے کی حیثیت سے ذات . . . . . . (PERSONALITY) رکھتا ہے یہی ذات (PERSONALITY) اس کے لئے وجہ تکریم ہے۔ (ولقد کرمنا بنی آدم) یعنی ہر آدمی محض آدمی ہونے کے اعتبار سے موجبِ تکریم ہے۔ انسان کی یہ قدر و قیمت ذاتی ہے۔ اضافی نہیں۔ یعنی ہر انسان' ہر آدمی' ہر فردِ انسانیت محض انسان ہونے کی رو سے مستحقِ تکریم و سزاوارِ تعظیم ہے۔ لیکن انسان کی ذات (PERSONALITY) غیر تربیت یافتہ (UN-DEVELOPED) شکل میں ہوتی ہے۔ اسکی نشوونما اور تکمیل معاشرے کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے معاشرے کا وجود لازمی ہے۔ لیکن معاشرہ، فرد کے لئے ہوتا ہے' فرد معاشرے کے لئے نہیں ہوتا۔ معاشرے کا فریضہ' فرد کی حفاظتِ ذات ہے (یا تکمیلِ خودی) ہے یعنی اسکی صلاحیتوں کی نشوونما اور تربیت و تکمیل اگر معاشرے کا کوئی آئین یا تقاضا' فرد کی ذات (اسکے جوہرِ خودی) پر دباؤ کا موجب بنتا ہے۔ اگر اس کی کسی پابندی سے فرد کی ذات . . . . . (PERSONALITY) میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ تو یہ معاشرہ اس قابل نہیں رہتا کہ اسے قایم رکھا جائے۔ معاشرے کا کام افراد میں باہمی ربط پیدا کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ اس سے ان کے مضمر جوہروں کی تربیت (DEVELOPMENT) ہو سکے۔ اس معاشرے میں استبداد تو کجا (عام معانی میں) حکومت کا بھی تصور نہیں ہو سکتا۔ اس میں حکومت سے مفہوم ہوتا ہے افرادِ معاشرہ کا باہمی رضامندی سے' قانونِ خداوندی کو اپنے اوپر

نافذ کرلینا ۔ اور چونکہ اس قانون کی علتِ غائی انسانی ذات کی تربیت و تکمیل ہوتی ہے اس لئے یہ تمام افرادِ معاشرہ ایک دوسرے کی ربوبیت (تربیت) کے ذمے دار بن جاتے ہیں ۔ (یعنی قرآن کی اصطلاح میں ربانی بن جاتے ہیں) ۔ پھر سن لیجئے کہ اس معاشرہ میں ہر فرد دوسرے فرد کی ربوبیت کا ذمہ دار بن جاتا ہے ۔ لہٰذا ان افراد پر مشتمل معاشرہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لے لیتا ہے جو خارجی کائنات میں خود خدا نے براہِ راست اپنے اوپر لے رکھی ہیں ۔ اشیائے کائنات کی ربوبیت (نشو و نما اور تکمیل) قانونِ خداوندی کے ماتحت، از خود ہوتی چلی جاتی ہے لیکن انسانی معاشرہ میں یہی چیز خود انسانوں کے ربانی (ربوبیت کے ذمہ دار) بننے سے ظہور میں آتی ہے ۔ اس لئے اس معاشرہ میں جس نظام کا نام حکومت رکھا جاتا ہے وہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ربوبیت کا ذمہ دار بن جائے ۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقہا ۔ "زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو" خارجی کائنات میں عطائے رزق (سامانِ زندگی) کی یہ ذمہ داری، قانونِ خداوندی کے ماتحت خود بخود (براہ راست) ادا ہوتی جاتی ہے ۔ لیکن انسانی دنیا میں یہی ذمہ داری معاشرے (یا اجتماعی نظام) کے ہاتھوں سے ادا ہوگی جو قانونِ خداوندی کی تنفیذ کا مدعی ہے ۔ اب سوچئے کہ ایسے معاشرے میں اس کا تصور تک بھی کیا جا سکتا ہے کہ افرادِ معاشرہ کے مفاد کا باہمی تصادم ہوگا ؟ جس معاشرے میں فرد دوسرے فرد کی ربوبیت کا ذمہ دار ہو، اس میں تصادمِ مفاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ لہٰذا اس معاشرے میں وہ تمام تضادات (CONTRADICTIONS) جو انسان کو انسان سے واسطہ پڑنے سے پیدا ہوتی تھیں، باہمی توافق میں بدل کر حل (RESOLVE) ہو جاتی ہے ۔

اب لیجئے انسان کے داخلی تضادات (اندرونی کشمکش) ۔ اس قانون کی رو سے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ۔ ہر فردِ انسانیت، روحِ خداوندی کا حامل ہے ۔ یعنی ہر انسان ایک ذات (PERSONALITY) رکھتا ہے لیکن انسانی ذات اپنی غیر تربیت یافتہ شکل (UNDEVELOPED FORM) میں ہوتی ہے اور خدا کی ذات (PERSONALITY) مکمل ترین شکل میں ۔ انسان کی ذات اس معاشرے کے اندر آہستہ آہستہ، بتدریج تربیت و تکمیل حاصل کرتی جاتی ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ صفاتِ خداوندی کی مظہر بنتی جاتی ہے خدا کی ذات (PERSONALITY) وہ ہے جس میں کوئی تضاد نہیں ۔ اس کے اسماء (صفات) میں کامل ہم آہنگی اور اکمل تناسب و توازن ہے ۔ اس لئے جوں جوں انسانی ذات تربیت حاصل کرتی جاتی ہے ۔ اس کے اندر تضادات خود بخود حل (RESOLVE) ہوتے جاتے ہیں ۔ اس طرح انسان کے داخلی تضادات بھی ہم آہنگی سے بدل جاتے ہیں ۔

اب ذرا سامنے لائیے اس معاشرے کو جس میں نہ انسان کے اندر (داخلی) تضادات ہوں اور نہ ہی انسان، دو انسان میں تضادات جس میں ہر فرد دوسرے افراد کی ربوبیت کا ذمہ دار ہو اور اس ربوبیت کا نتیجہ انسانی ذات کی تربیت و تکمیل ہو ۔ کیا ایسے معاشرے میں کوئی فرد بھی ایسا ہو سکتا ہے جس پر کبھی کوئی وقت ایسا آئے جس میں وہ محسوس کرے کہ وہ تنہا ہے ۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں ۔ یہ ناممکن ہے ۔ اس معاشرے کا وجود ہی ان افراد سے وابستہ ہوتا ہے ۔ اس میں یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اس معاشرے میں جماعت (سوسائٹی) ایک اجتماعی نظم و نسق (ORGANILATION) کی حیثیت لئے ہوتی ہے افراد کو جذب کر لینے والا

وجود (ORGANISM) نہیں بن جاتی۔ اس معاشرہ میں ایک انسان (فرد۔ نفس) کی قیمت تمام نوعِ انسان کے برابر قرار دی جاتی ہے۔ اس لئے اگر معاشرے کی کسی کوتاہی یا غفلت سے، ایک فرد بھی ناحق ضائع ہو جائے تو پورے کا پورا معاشرہ، جملہ انسانیت کے قتل کے جرم کا مرتکب قرار دیا جاتا ہے۔ فکانما قتل الناس جمیعا (۵/۳۲) ۔گویا اس نے تمام نوع انسان کو قتل کر دیا۔

غور کیجئے کہ ایسے معاشرے میں کسی فرد کو اس کا خیال تک بھی آسکتا ہے کہ وہ خودکشی کرے! اس معاشرے میں ہر فرد کو خود زندگی اور انسانی ذات کی صحیح صحیح قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ اور پورے کا پورا معاشرہ ہر فرد کی حفاظت و صیانت اور تربیت و تکمیل ذات کے لئے سرگرم عمل رہتا ہے۔ اندریں حالات دنیا سے خودکشی کا وجود مٹانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ دنیا میں اس قسم کا معاشرہ متشکل کر دیا جائے۔ اس قسم کے معاشرے کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ پہلے انسانی فکر میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔ اور وہ کائنات، انسانی ذات اور اس کے اقدار کے متعلق تمام تصورات ٹھیک ٹھیک سمجھ لے۔ اس کا نام ہے تعلیم الکتاب والحکمۃ۔ طلوعِ اسلام کی تمام جد و جہد کا منتہیٰ اور ہر سعی و کاوش کا مقصود و مطلوب، اس قسم کے قرآنی معاشرہ کی تشکیل و قیام ہے۔ اسی کے لئے وہ قرآنی فکر کو عام کرنے کے لئے ہمہ تن اضطراب رہتا ہے۔ موجودہ مذہبی تصورات کے خلاف اس کا جہاد (جسے یہ مُلّا کے مذہب یا عجمی سازش کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے) اس پروگرام کا حصہ لا ہے۔ اس لئے کہ کوئی نئی عمارت قائم نہیں ہو سکتی جب تک اس کی پہلی غلط بنیادوں کو اکھیڑا نہ جائے۔ لیکن صرف حصہ لا کسی پروگرام کی کامیابی کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے حصہ الّا کی بھی اتنی ہی (بلکہ اس سے زیادہ) ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے بھی طلوعِ اسلام ساتھ کے ساتھ تعمیری نقشے پیش کرتا جا رہا ہے۔ لیکن اس باب میں اس سے زیادہ وضاحت کی ضرورت ہے۔ ہمارے پیش نظر پروگرام کے مطابق وہ وقت بھی زیادہ دور نہیں جب طلوعِ اسلام اس باب میں "متشابہات" سے "محکمات" تک آ جائیگا۔ قرآن پر غور و فکر سے یہ حقیقت ابھر کر ہمارے سامنے آگئی ہے کہ قرآنی خطوط پر ذہنی انقلاب کے بعد اس قسم کے معاشرے کی تشکیل جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، زیادہ وقت نہیں لیا کرتی۔

رہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرشِ بریں\
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

اور آپ جانتے بھی ہیں کہ ——— چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور۔ . . . .

اس لئے انقلابِ فکر کے بعد، تشکیل معاشرہ کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا۔ درحقیقت صبر آزما، ہمت طلب اور استقامت خواہ مرحلہ "انقلاب اندر شعور" ہی کا ہوتا ہے۔ یہ ہو جائے تو پھر عشق کی آگ جست تمام قصے طے کر دیا کرتی ہے۔

طلوعِ اسلام اس مقصد کو لیکر اُٹھا ہے اور اسے اللہ کی توفیق سے پورا بھروسا ہے کہ اس مقصد کی تکمیل ہو کر رہے گی۔

واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب

(باقی لمعات صفحہ ۶۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

ضربِ الکلیم

[ذیل میں وہ "پیش لفظ" شائع کیا جارہا ہے جو محترم پرویز صاحب نے ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے بالقابہ کے "ضربِ کلیم" کے عربی ترجمے کیلئے تحریر فرمایا۔ اس کا حصہ اول مئی کے طلوع اسلام میں شائع ہوچکا ہے لیکن مضمون کے تسلسل اور بالخصوص اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے مکمل شائع کیا جارہا ہے۔ طلوع اسلام]

جس کتاب کا ترجمہ آپ کے پیش نظر ہے، علامہ اقبال نے اس کا نام ضربِ کلیم رکھا اور خود ہی اس کی تشریح ان الفاظ سے کردی

اعلانِ جنگ عصرِ حاضر کے خلاف

میرے نزدیک یہ الفاظ علامہ اقبال کی صرف ایک کتاب ضربِ کلیم ہی کے شارح نہیں بلکہ ان کے پورے کے پورے پیغام کے ایک عظیم حصے کے مفسر ہیں۔ اگر حضرت علامہ کے پورے پیغام کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو اہم حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ ایک حصہ نفیرِ انقلاب ہے اُس "غیر منزل من اللہ" اسلام کے خلاف، جسے عجمی سازش نے نہایت سادگی اور پرکاری سے وضع کیا، اور دامِ ہمرنگ زمین کی صورت میں، عینِ اسلام بنا کر اس امت پر مسلط کردیا جو ان غیر قرآنی تصورات کو نکالنے کے لئے مبعوث ہوئی تھی۔ عجم کی یہ سازش درحقیقت انتقام تھی یہود ونصاریٰ ومجوس کی ان شکستوں کا جو انھیں میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی تیغِ حق کے مقابلے میں اٹھانی پڑیں۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ اس ملتِ مجاہدین کی قوت وسطوت کا راز قرآن کی حیات بخش تعلیم میں ہے۔ لہٰذا انھوں نے ایسی چال چلی کہ مسلمانوں کو قرآن سے یکسر بیگانہ بنا کر، غیر قرآنی اسلام کے فریب میں الجھادیا اور یہ کچھ اس کامیاب طریق سے کیا کہ سادہ لوح مسلم اس سراب رنگ وبو کو سچ مچ کا گلستاں سمجھنے لگ گیا۔ یونان کا خواب آور فلسفہ، حشیشیں۔ مجوس کی غلامانہ نسل پرستی۔ یہود کی قشری شریعت رسومات۔ رہبان نصاریٰ کی مرگ آفریں خانقاہیت، ایک ایک کرکے اسلام کے لاینفک اجزا بن گئے اور اس طرح یہ ملت جو کبھی ذوقِ عمل سے شعلۂ جوالہ تھی، کوتاہیٔ امل سے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اقبال کے پیغام کا ایک حصہ اسی "غیر منزل من اللہ" اسلام کے لئے پیامِ مرگ اور قرآنی اسلام کے احیاء کے لئے نشیدِ حیات تھا۔

علامہ کے پیغام کا دوسرا حصہ اس فتنے کے خلاف احتجاجِ مسلسل تھا جو تہذیبِ مغرب کے رنگ میں، طوفان در طوفان امنڈے چلا آرہا تھا اور جس کی تموج انگیز طغیانیاں ملتِ اسلامیہ کی نژادِ نو کو خس وخاشاک کی طرح بہائے لئے جارہی تھیں۔ ضربِ کلیم اس تہذیبِ عصرِ حاضر کے جنود وعساکر کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔

سوال یہ ہے کہ تہذیبِ حاضر کہتے کسے ہیں اور اقبال نے اس کی اسقدر مخالفت کیوں کی؟ اس سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آسکتا، جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ اسلامی تہذیب کیا ہے۔

جس شخص کے سامنے قرآن کے اوراق کھلے ہیں اس پر یہ حقیقت روشن ہے کہ اسلام ایک ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی ہے جسے الدین کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک نصب العین مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنے اختیارات کا استعمال کر سکتا ہے۔ یہ نصب العین اور حدود دونوں غیر متبدل ہیں۔ انہی کو ابدی صداقتیں یا مستقل اقدارِ زندگی کہا جاتا ہے۔

قرآن کی رُو سے اگرچہ حیات کی نمود مختلف پیکروں میں ہوتی ہے، حیات کا سرچشمہ ایک ہے اور یہی سرچشمہ ان ابدی صداقتوں کی اصل ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ سرچشمۂ حیات اور ابدی صداقتوں کے سرچشمہ کی وحدت کے عقیدے سے فطری طور پر نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ

(الف) ہر انسان من حیث الانسان زندگی کی ممکنات اپنی ذات میں مضمر رکھتا ہے جن کی نشوونما اور نمود زندگی کا مقصود ہے۔ ان جواہرِ مضمر کی پختگی اور تابندگی سے انسان میں شانِ انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا تحفظ بقا اور تسلسل (بعد از ممات) انسانی جدوجہد کا ماحصل ہے۔

(ب) تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں جو جغرافیائی، لسانی، نسلی اور وطنی حدود سے متاثر نہیں ہوتی۔

(ج) تمام نوعِ انسانی کی فلاح کا راز ایک ہی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہے جو وحی کے ذریعے مل سکتا ہے اور جو آج اس آسمان کے نیچے قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔

ان محکم اصولوں کی بنیاد پر اسلام ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں نوعِ انسانی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی شرفِ انسانیت کے سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچے۔ اس معاشرے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) اس میں افرادِ معاشرہ اپنے اندر ان صفاتِ خداوندی کو منعکس کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جنہیں قرآن اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے اور جو کائنات میں مستقل اقدار کا سرچشمہ ہیں۔

(۲) ان افراد میں ایسا ضبط پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ان صفات میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اسماء کے لئے حسنیٰ کی شرط ضروری ہے اور حسن نام ہے تناسب کے اعتدال کا۔

(۳) ان افراد کی نگاہوں میں ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ صحیح صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فلاں قسم کے خارجی حادثہ کی صورت میں فلاں قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہونا چاہئے۔

(۴) ان افراد پر مشتمل جماعت میں اشیاءِ فطرت کی تسخیر کی قوت اور ان کے ماحصل کو فلاحِ انسانیت کے لئے صرف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۵) وحدتِ خالق، وحدتِ انسانیت اور وحدتِ واستلافِ ملت کے محکم تصور سے، انسان اور کائنات، انسان اور انسان، اور خود انسان کے اپنی ذات کے تضادات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے جس سے انسانی معاشرہ کی ناہمواریاں مٹتی چلی جاتی ہیں۔

(۶) اس جماعت کا ہر فرد اپنے آپ کو خدا کی صفتِ رب العالمین کا مظہر سمجھتے ہوئے بلا مزد و معاوضہ، انسانیت کی ربوبیت کا کفیل بن جاتا ہے۔ اس طرح تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بھی از خود پوری ہوتی جاتی ہیں اور ان کی فطری صلاحیتوں کے کامل نشوونما کے وسائل و اسباب یکساں طور پر میسر ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح زندگی کی جوئے رواں ہنستی کھیلتی، رقص کرتی، شاداں و فرحاں اقطار السمٰوٰت والارض سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ ہے مختصر سے الفاظ میں قرآنی تہذیب کا ماحصل۔ اس کے برعکس تہذیبِ عصر حاضر اس تصویر کی یکسر نقیض ہے۔ اس تہذیب کی اساس یہ فلسفہ ہے کہ مادی عناصر کے محض اتفاقیہ طور پر یکجا ہو جانے سے حیات وجود میں آ گئی اور ان عناصر کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دنیا یہی مادی عناصر کی دنیا ہے جس میں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ لہٰذا دنیا میں نہ کوئی مستقل اقدار ہیں نہ قانونِ مکافاتِ عمل۔ خیر وہ ہے جس سے کسی فرد یا افراد کے گروہ، قوم کو ذاتی مفاد حاصل ہو جائے (خواہ اس سے دوسرے افراد یا دوسری اقوام کی رگِ حیات ہی کیوں نہ کٹ جائے) اور شر وہ ہے جس سے کسی فرد یا قوم کا ذاتی نقصان ہو۔ ہر فرد یا قوم کا نصب العین حیات منفعتِ خویش کا حصول ہے اور علم و عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس منفعت کے حصول کے لئے اسباب و تدابیر اور حیل و مکائد فراہم کرے۔ اس فلسفۂ حیات (یا تہذیبِ عصرِ حاضر) کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر خود اہلِ مغرب کی تحقیق کے مطابق، وہاں کی آبادی کا ہر چھٹا فرد ایسا ہے جسے عمر کا کچھ نہ کچھ حصہ پاگل خانے میں گذارنا ہوگا۔ اور اجتماعی طور پر یہ عالم ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں یا تو باہمی کشت و خون میں .... مصروفِ پیکار رہتی ہیں یا اس کشت و خون کی تیاری میں مشغول۔

اقبالؒ نے اقوامِ مغرب کے فلسفۂ حیات اور نظریۂ سیاست و عمرانیت کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا جس سے اس پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ فلسفۂ حیات اور منہاجِ زندگی دنیا میں جہنم پیدا کر دینے کا موجب ہے۔ دوسری طرف قرآنی بصیرت نے اس پر حقائقِ زندگی کو اس طرح واشگاف کر دیا کہ وہ بادلوں میں چھپی ہوئی بجلیوں اور ہواؤں میں مستور طوفانوں کو بے حجاب اپنے سامنے دیکھ لیتا تھا۔ یہی تھی وہ قرآنی بصیرت جس کی بنا پر اس نے ۱۹۰۷ء میں اقوامِ مغرب کو للکار کر کہہ دیا تھا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی ۔۔۔ جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اس وقت سے لیکر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اقبالؒ اقوامِ مغرب کو بالعموم اور ملتِ اسلامیہ کو بالخصوص، اس اہرمنی تہذیب کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتا رہا۔ اس مجموعۂ انذار و تنذیر کا نام ہے "ضربِ کلیم"، جس سے اقبالؒ بتکدۂ عصرِ حاضر کے تمام بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے لیکن وہ اپنے عصائے کلیمی سے صرف فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت ہی کے نگاہ فریب سحر کو نہیں توڑتا بلکہ وہ اس کے بعد اپنی قوم کو قندیلِ قرآنی کی روشنی میں، فاران و سینا کی ان محفوظ و بابرکت وادیوں میں لے جاتا ہے جہاں زمین سے نور و فلاح کے چشمے ابلتے اور آسمان سے رشد و سعادت کے من و سلویٰ اترتے ہیں۔

پیامِ اقبالؒ کی خوش بختی ہے کہ وہ رفیقِ محترم، صاحب السعادۃ، عبدالوہاب عزام بے کی "ضرب کلیم" اور "جوئے شیر" کے تصدق تنگنائے اردو سے نکل کر بحیرۂ عرب میں بادبان کشا ہوتا ہے اور اس طرح اپنی اس افادیت کو جو اس وقت تک شرمندۂ ساحل تھی بیکراں بنا رہا ہے۔

اور خوش بختی ہے خود عربی بولنے والی ملتِ اسلامیہ کی، جو اس پیامِ حیات بخش سے، جو معنوی لحاظ سے ان سے اسقدر قریب ہونے کے باوجود لفظی اعتبار سے آشنا دور تھا، شرفِ تعارف حاصل کر رہی ہے۔

خدا کرے یہ پیامِ انقلاب، سرزمینِ عرب کے لئے پھر وہی تخمِ صالحہ بن جائے جس سے ایک مرتبہ پہلے وہ شجرِ بلند و بالا پیدا ہو چکا ہے، جس کی رفعتوں کے متعلق اصلها ثابت وفرعها فی السماء کہا گیا تھا اور جس کی ہمہ گیر پہنائیوں کو لا شرقیۃ ولا غربیۃ سے تعبیر کیا گیا تھا۔ اس شجرِ طیب و مبارک کی روئیدگی و بارآوری صرف قرآنی ماحول میں ممکن ہے اور یہی پیامِ اقبال کا مقصود و منطوق ہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن		نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یہانتک تو ضربِ کلیم کے متعلق ہوا۔ اقبال کے عمومی مطالعہ کے ضمن میں ایک چیز ایسی ہے جسے مدِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اقبال کی شاعری میں عربی اور فارسی لغت کے اکثر الفاظ ایسے ہیں جنہیں وہ ان کے لغوی معنوں میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وہ کلامِ اقبال کی خاص اصطلاحات ہیں۔ جب تک ان الفاظ کے اصطلاحی معانی سمجھ میں نہ آئیں، اقبال کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آسکتا۔ مثلاً علم و عشق، عقل و دل، ذکر و فکر، خبر و نظر، سوز و ساز، بادرویش، قلندر، مردِ حُر وغیرہ الفاظ اسی قبیل کے ہیں۔ یہ تمام اصطلاحات اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں لیکن وہ اصطلاح جو فکرِ اقبال میں محور کا حکم رکھتی ہے اور جس کے گرد اس کا سارا کلام گردش کرتا ہے، خودی ہے۔ اقبال سے پہلے یہ لفظ ہمارے ہاں غرور اور تکبر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اقبال نے اسے بالکل جداگانہ معنی پہنا دیئے اور یہ مفہوم اب اس درجہ رائج ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے قدیم معانی بالکل نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔

"خودی سے اقبال کا مفہوم کیا ہے؟" اس سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دینا آسان نہیں۔ اسلئے کہ اقبال کا فلسفہ درحقیقت فلسفۂ خودی ہے اور جب تک اقبال کا پورا فلسفہ سامنے نہ آجائے اس اصطلاح کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس تفصیل و اطناب کا یہ موقعہ نہیں۔ لیکن چونکہ ضربِ کلیم میں بھی یہ لفظ بار بار سامنے آئیگا اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قلیل ترین الفاظ میں اس اصطلاح کا طائرانہ سا تعارف کرا دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ "کیا انسان کی انفرادیت، شخصیت یا انا کوئی مستقل حقیقت ہے یا محض فریبِ تخیل"؟ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہو گی جس کے مفکرین نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش نہ کی ہو۔ افلاطون، اور اس کی اتباع میں حکمائے ایران اور ہند، اس نتیجے پر پہنچے کہ کائنات میں صرف حیاتِ کلی کا وجود ہے اسلئے انسانی ذات (انا یا شخصیت) محض فریب ہے۔ یہ فریب عمل کے زور پر قائم رہتا ہے اور عمل کی بنیاد آرزو پر ہے۔ لہذا اس فریب سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان ترکِ آرزو سے ترکِ عمل کرے اور اس طرح انسانی ذات کا حباب ٹوٹ کر حیاتِ کلی کے بحر میں گم ہو جائے۔ اس (فنائے ذات) کا نام نجات ہے اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ یہی وہ فلسفۂ حیات تھا جو ہمارے ہاں نظریۂ وحدت الوجود کے نام سے رائج ہوا اور جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن عمل قوم کو خاک کے آغوش میں سلا دیا۔

اقبال نے اس فلسفۂ حیات کے خلاف مسلسل احتجاج کیا اور اس کے برعکس فلسفۂ خودی پیش کیا۔ اس فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ حیات عالمگیر

یا کلی نہیں بلکہ انفرادی ہے ۔ حتیٰ کہ خدا بھی ایک فرد ہے اگرچہ وہ اپنی انفرادیت میں یگانہ اور نادر ہے ۔ اس انفرادی زندگی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام خودی ہے جس سے انسانیت کی شخصیت یا انفرادیت متشکل ہوتی ہے ۔ لہٰذا انسانی زندگی کا مقصود سلبِ ذات نہیں بلکہ اثباتِ خودی ہے ۔ اقبال کے نزدیک جوں جوں انسان اس فردِ کامل و نادر کی مانند ہوتا جاتا ہے (جسے انائے مطلق یا خدا کہتے ہیں) وہ خود بھی منفرد اور نادر ہوتا جاتا ہے ۔ اس کا نام استحکامِ خودی ہے ۔ "خدا کی مانند" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو منعکس اور اس طرح اُس انائے مطلق کو اپنے اندر جذب کرتا جائے ۔ خودی کے ضعف اور استحکام کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنی راہ میں آنیوالے موانعات پر کس حد تک غالب آتا ہے ۔ زندگی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مادہ شر ہے اور اس لئے قابلِ نفرت ۔ مادہ شر نہیں بلکہ یہ زندگی کی خوابیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے ۔ جب انسانی خودی موانعات پر غلبہ حاصل کرنے سے پختہ ہو جاتی ہے تو پھر موت کا جھٹکا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ۔ اس طرح انسانی زندگی دوام سے ہمکنار ہو جاتی ہے ۔ بنا بریں ہر وہ عمل جس سے خودی میں استحکام پیدا ہو خیر ہے ۔ اور ہر وہ کام جس سے خودی کمزور ہو جائے شر ہے ۔

اقبال کے نزدیک ارتقائے خودی کا پہلا مرحلہ تخلیقِ مقاصد یا تولیدِ آرزو ہے ۔ آرزو عینِ حیات اور اصلِ قوت ہے کیونکہ یہی عمل کی محرک ہوتی ہے ۔

تخلیقِ مقاصد کے بعد دوسرا مرحلہ حصولِ مقاصد کیلئے جہدِ مسلسل ہے ۔ حصولِ مقصد کیلئے اسی تپش و خلش کا نام ، اقبال کی اصطلاح میں عشق ہے ۔ اس جدوجہد کی کامیابی کیلئے تین شرائط ناگزیر ہیں ۔ اول اطاعت ، اطاعت سے مراد ہے قوانینِ خداوندی (قرآن) کی کامل اتباع جس کیلئے قرآنی معاشرہ کی تشکیل ضروری ہے ۔ اس اطاعت سے انسان کے اندر ضبطِ نفس پیدا ہو جاتا ہے اور یہ دوسری شرط ہے ۔ ضبطِ نفس سے مراد خواہشات کا دبانا نہیں بلکہ ان کا (یا بالفاظِ دیگر قوتوں کا) رُخ دوسری طرف بدل دینے سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے ۔ اس توازن کی اکمل ترین شکل ذاتِ خداوندی ہے جس میں متضاد صفات کا باہمی توازن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے ۔ اس تطہیرِ فکر و عمل اور تہذیبِ نفس سے انسان اس مقام تک جا پہنچتا ہے جسے اقبال نیابتِ الٰہیہ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ تیسری شرط ہے ۔ نیابتِ خداوندی سے اقبال کا مفہوم وہ قوتِ مجریہ ہے جو دنیا میں قوانینِ خداوندی (ضابطۂ قرآنی) کی تنفیذ و ترویج کا موجب بنتی ہے ۔ (نیابتِ الٰہیہ سے یہ مراد نہیں کہ انسان ، خدا کا قائم مقام یا جانشین بن جاتا ہے اسلئے کہ جانشینی صرف اس کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو) ۔ یہ مقام مومن ہے اور یہی مقام اقبال کے نزدیک استحکامِ خودی کا آخری نقطہ ہے ۔ اس مقام پر پہنچکر انسان ساری دنیا پر غالب آجاتا ہے ۔ دنیا اس پر غالب نہیں ہوتی ۔ اس کیفیت کا نام اقبال کی اصطلاح میں فقر ، درویشی یا قلندری ہے ۔ یعنی سب کچھ مسخر کرلینے کے بعد وہ استغنا جو اللہ کی صفتِ صمدیت اور "غنی عن العالمین" کا مظہر ہو ۔

ان افراد پر مشتمل جماعت کا نام امتِ مسلمہ ہے اور اسی جماعت کی نشأۃِ ثانیہ ، پیامِ اقبال کا منتہیٰ و مقصود ۔ وہ امت جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

میانِ اُمتاں والا مقام است — کہ آں امت دوگیتی را امام است
نیاساید ز کارِ آفرینش — کہ خواب و خستگی بروے حرام است

اور

بباغاں عندلیبے خوش صفیرے — براغاں جرّہ بازے زود گیرے
امیرِ او بسلطانی فقیرے — فقیرِ اُو بدرویشی امیرے

لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیداً ۔

یتیم پوتے کی وراثت

یوں تو قرآن کریم کی تعلیم کا کونسا گوشہ ہے جس کی اعجازی کیفیت سے چشمِ بصیرت محوِ حیرت نہیں رہ جاتی۔ (اس کا تو ایک ایک لفظ بے مثل و بے نظیر ہے) لیکن بعض احکام کی جامعیت ایسی ہے جس پر غور و فکر سے روح وجد میں آجاتی ہے۔ انہی احکام میں قرآن کا قانونِ وراثت بھی ہے۔ قرآن نے اپنی چار مختصر سی آیات میں اتنا اہم اور وسیع قانون اس انداز سے اصولی طور پر سمیٹ کر رکھ دیا ہے کہ اس کی جامعیت اور ایجاز پر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن ہماری بدبختی ملاحظہ ہو کہ یہی قانونِ وراثت جب ملا کے ہتے چڑھ گیا تو نہ صرف یہ کہ یہ قانون دنیا کا مشکل ترین مسئلہ بن گیا بلکہ اس کی بعض شقیں ایسی مضحکہ انگیز شکلیں اختیار کر گئیں کہ انہیں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ انہی گوشوں میں ایک مسئلہ یتیم پوتے کی وراثت کا ہے چونکہ یہ مسئلہ (قانونی مسائل کی طرح) فنی ہے اس لئے اسے ذرا غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس کی فنی اصطلاحات سے صرفِ نظر کر کے اسے عام فہم الفاظ میں سمجھایا جائے۔ ذرا ذیل کے نقشے کو سامنے رکھئے

زید	
(زید کا بیٹا) بکر	عمر (زید کا بیٹا)
(بکر کا بیٹا) حامد	رشید (عمر کا بیٹا)

زید کی زندگی میں بکر فوت ہو گیا۔ اس کے بعد زید وفات پا گیا۔ زید کی وفات کے وقت اس کا بیٹا عمر بھی زندہ ہے۔ (اور رشید بھی) اور اس کے ساتھ اس کا یتیم پوتا (حامد) بھی۔ ملا کا مذہب ہے کہ زید کی ساری جائداد عمر کے حصے میں آگئی۔ حامد کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس کا قصور؟ یہی کہ وہ یتیم ہے۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں، اسے وراثت سے کیوں نہ محروم کیا جائے؟

مرے کو مارے شاہ مدار

ایسے ہی مواقع کے لئے کہا گیا ہے۔

ہم نے، اس سے پیشتر، ایک مرتبہ مختصراً اس مسئلے کے متعلق طلوعِ اسلام (کے باب المراسلات) میں لکھا تھا۔ لیکن چونکہ اب یہ مسئلہ ملک کا قانون بن گیا ہے، اس لئے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھا جائے۔ پہلے ان دلائل کو لیا جائے جو اس کی محرومی کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس مضمون کو چھاپ دیا جائے جو اس سے قبل طلوعِ اسلام میں لکھا جا چکا ہے اور پھر علامہ اسلم جیراجپوری کا مقالہ "محجوب الارث" شائع کر دیا جائے۔ موخر الذکر مقالہ آجکل نایاب ہو چکا تھا۔ بڑی تلاش کے بعد ایک دوست نے . . . . ہم پہنچایا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس طرح ایک اہم تحقیقی مضمون

طلوع اسلام کے دفتین میں محفوظ ہو جائے گا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اب آیئے ان دلائل کی طرف۔ رسالہ ترجمان القرآن (بابت مارچ ۱۹۵۲ء) میں حسب ذیل سوال اور اس کا جواب شائع ہوا ہے۔

سوال۔ دادا کی زندگی میں اگر کسی کا باپ مرجائے تو پوتے کو وراثت میں سے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ مشہور شرعی مسئلہ ہے جس پر اس وقت کی حکومت کی طرف سے عمل ہو رہا ہے۔ اس بارے میں مختلف مسالک کیا ہیں۔ اور آپ کس مسلک کو مزاج اسلامی سے قریب تر خیال فرماتے ہیں۔ اگر آپ کا مسلک بھی مذکورہ ہی ہے تو اس الزام سے بچنے کی کیا صورت ہے کہ اسلامی نظام جو یتیم کی دستگیری کا اسقدر مدعی ہے ایک یتیم کو محض اس لئے دادا کی وراثت سے محروم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو دادا کی وفات کے بعد تک زندہ نہ رکھ سکا۔"

اس کا جواب، ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی طرف سے یہ دیا گیا ہے۔

جواب، فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ جہانتک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جاسکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں گو اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ ویسے بھی یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے، کیونکہ پوتا بہرحال اپنے باپ کے واسطے ہی سے دادا کے مال میں حقدار ہو سکتا ہے نہ کہ براہ راست خود۔ اسی طرح بہو اپنے شوہر کے واسطے سے خسر کے مال میں سے حصہ پا سکتی ہے نہ کہ براہ راست خود۔ اگر ایک شخص کا بیٹا اس کی زندگی میں مرجائے اور وہ شادی شدہ نہ ہو تو آپ خود مانیں گے کہ اس کا حصہ ساقط ہو جائے گا۔ یہ نہیں کہ اس شخص کے مرنے پر اس کے ترکہ میں سے اس کے فوت شدہ بیٹے کا حصہ بھی نکالا جائے اور پھر اس کی میراث اس کی ماں اور اس کے بھائیوں وغیرہ کو پہنچائی جائے۔ اسی طرح اگر فوت شدہ لڑکے کی کوئی بیوی موجود ہو تو آپ خود مانیں گے کہ وہ اپنے خسر کے ترکہ میں سے حصہ پانے کی مستحق نہیں ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا نکاح ثانی ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ پھر آپ کو کیوں اصرار ہے کہ صرف اس کا بیٹا موجود ہونے کی صورت میں اس کا حصہ ساقط نہ ہو بلکہ وہ اس کے بیٹے کو پہنچے؟

رہا یتیم کی پرورش کا سوال، تو شریعت کی رو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کی پرورش کا انتظام کریں۔ نیز شریعت نے وصیت کا حکم اسی لئے دیا ہے کہ اگر کوئی مرنے والا اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو اور اس کے خاندان میں کچھ لوگ مستحق موجود ہوں تو وہ ان کے حق میں وصیت کر دے ⅓ مال کی حد تک وہ وصیت کر سکتا ہے اور اس میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر وہ کوئی یتیم پوتا چھوڑ رہا ہے، یا کوئی بیوہ بہو چھوڑ رہا ہے جو بے سہارا ہو، یا کوئی بیوہ بھاوج یا غریب بھائی یا بیوہ بہن چھوڑ رہا ہے تو ان کے لئے وصیت کر جائے۔ یہ گنجائش اسی لئے رکھی گئی ہے کہ قانونی وارثوں کے سوا خاندان میں جو لوگ مدد کے محتاج ہوں ان کی مدد کا انتظام کیا جاسکے۔

مودودی صاحب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ انہیں قرآن وحدیث میں کوئی ایسا حکم صریح نہیں ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جاسکے۔ لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں کہ "لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے"۔ یہی وہ تقلید ہے جس کی قرآن اس شدت سے مخالفت کر رہا ہے اور جس کی وجہ سے قوموں میں سوچنے اور سمجھنے کی قوت سلب ہوجاتی ہے اور وہ کالانعام بل ھم اضل کی (حیوانی، بلکہ ان سے بھی بدتر) سطح پر پہنچ جاتی ہیں خود مودودی صاحب اپنی بیشتر تحریروں میں لکھ چکے ہیں کہ جن معاملات میں قرآن اور حدیث خاموش ہوں انہیں ہم اپنی بصیرت سے حل کریں گے۔ اس چیز کو انھوں نے "دستور پاکستان" کے اس خاکے میں بھی بیان کیا ہے جو ان کی طرف سے مرتب ہوکر شائع ہوا تھا۔ لیکن اب ان کا ارشاد یہ ہے کہ جو امور سلف سے خلف تک وراثتاً منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں ان کے خلاف رائے دینا مشکل ہے، خواہ ان کی تائید میں قرآن وحدیث کا کوئی حکم بھی نہ ملے۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے اس مسلک کی تائید میں دلائل لاکر (بزعم خویش) ثابت کیا ہے کہ یہ مسلک معقول بھی ہے۔ اب ان دلائل اور ان کی معقولیت کو دیکھئے۔ دلیل یہ ہے کہ

(i) پوتا، اپنے باپ کے واسطے سے ہی دادا کے مال میں حقدار ہوسکتا ہے، نہ کہ براہ راست

جس طرح بہو، اپنے شوہر کے واسطے ہی سے خسر کے مال میں حصہ پاسکتی ہے۔

(ii) فوت شدہ وارث کا حصہ نہیں نکالا جاتا۔ اس لئے یتیم پوتا اپنے دادا کے مال سے حصہ نہیں پاسکتا۔

یہ دلائل، عقل، علم اور قرآن سب کے خلاف ہیں۔ حتیٰ کہ فقہی قانونِ وراثت کے بھی خلاف۔

مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ "پوتا اپنے باپ کے واسطہ سے ہی دادا کے مال میں حقدار ہوسکتا ہے"۔ اور جب واسطہ نہ رہے تو یہ حق ساقط ہوجاتا ہے"۔ یہ دعویٰ بنیادی طور پر غلط ہے۔ ذرا اس نقشے کو سامنے لائیے جو پہلے پیش کیا جاچکا ہے۔ مودودی صاحب کے دعوے کی بنا پر، رشید، عمر کے واسطے سے زید کے مال کا حقدار ہے۔ اور حامد اس لئے زید کے مال کا حقدار نہیں کہ اس کا واسطہ (بکر) موجود نہیں ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا عمر کی موجودگی میں رشید اپنے دادا (زید) کے مال سے ایک پائی بھی پاسکتا ہے؟ عمر کی موجودگی میں، زید کے مال کا حقدار عمر ہی ہے نہ کہ رشید۔ یہ قانونِ وراثت کا ابتدائی قاعدہ ہے۔ اب دیکھئے کہ اس دلیل کی رو سے بات کیا بنی۔

(الف) حامد اپنے دادا (زید) کے مال سے حصہ نہیں پاسکتا کیونکہ ان دونوں کا درمیانی واسطہ (بکر) موجود نہیں ہے۔

(ب) رشید اپنے دادا (زید) کے مال سے حصہ نہیں پاسکتا کیونکہ ان دونوں کا درمیانی واسطہ (عمر) موجود ہے۔

اب اور آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب کی دلیل کو پھر دہرا لیجئے کہ حامد اپنے باپ (بکر) کے واسطے سے ہی زید کے مال کا حقدار ہوسکتا ہے۔ اور چونکہ حامد اور زید کے درمیان واسطہ (بکر) نہیں رہا اس لئے حامد زید کے مال کا حقدار نہیں ہوسکتا۔ لیکن مودودی صاحب کو شاید اس کا علم نہیں کہ اگر زید کی زندگی میں حامد فوت ہوجائے تو زید اس کے مال کا حقدار ہوتا ہے۔

اور یہ بھی کہ اگر زید کی زندگی میں عمر بھی فوت ہوجائے تو زید کی موت پر حامد اور رشید دونوں اس کے مال کے حقدار ہوجاتے ہیں۔

کیا مودودی صاحب بتائیں گے کہ

(۱) حامد اور زید کے درمیان کونسا واسطہ تھا جس کی رو سے زید، حامد کے مال میں حقدار بن گیا؟ اور

(۲) زید کی زندگی میں عمر کے مرجانے کی صورت میں، وہ کونسا واسطہ تھا جس کی رُو سے حامد اور رشید دونوں یتیم پوتے زید کے مال کے وارث قرار پاگئے؟

یہ تھی مودودی صاحب کی دلیل! حیرت ہے کہ انھیں (قرآن تو ایک طرف) فنِ وراثت کے ابتدائی اصولوں تک سے بھی واقفیت نہیں۔

مودودی صاحب نے یتیم پوتے کے ساتھ بیوہ بہو کی مثال پیش کرکے اس شبہ کو اور بھی قوی کردیا ہے کہ انھیں فی الواقعہ قانونِ وراثت کے مبادیات تک کا بھی علم نہیں۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ اس مثال سے عوام اس کے قائل ضرور ہوگئے ہوں گے کہ مودودی صاحب کی دلیل بڑی وزنی ہے۔ کیونکہ جب بکر کی بیوہ، زید کے مال سے حصہ نہیں پاسکتی تو بکر کا بیٹا (حامد) کس طرح حصہ پالے گا!

قرآن کی رو سے رشتہ داروں کی دو قسمیں ہیں (اور یہ تقسیم ایسی کھلی ہے کہ ہر شخص اسے تسلیم کریگا)۔ ایک نسبی رشتہ دار یعنی وہ جو اشتراکِ نسب کی بنا پر رشتہ دار ہوں۔ مثلاً باپ، دادا، پردادا وغیرہ اور نیچے کی طرف بیٹا، پوتا، پرپوتا وغیرہ۔ یا بھائی بہن۔

دوسری قسم عقدی رشتے کی ہے جس میں میاں بیوی شامل ہیں۔ میاں بیوی کا رشتہ صرف نکاح کے عہد و پیمان سے ہوتا ہے، اشتراکِ نسب کی بنا پر نہیں ہوتا۔ اس لئے میاں بیوی کا وارث ہوتا ہے اور بیوی میاں کی۔ بکر کی بیوہ، زید سے نہ تو نسبی رشتے میں ہے نہ اس کے عقد میں آئی ہے۔ پھر وہ زید کے مال میں کس طرح وارث ہوسکتی ہے؟ وہ اپنے شوہر کے مرنے پر اس کے ترکہ سے وراثت پاسکتی ہے۔ زید سے اس کا وراثتی تعلق ہی نہیں۔ نسب کا رشتہ مستقل رشتہ ہوتا ہے لیکن عہدی رشتہ، صرف عہد و پیمان تک رہتا ہے۔ بیٹا، بیٹا ہی رہتا ہے خواہ اس کا باپ زندہ ہو یا مرچکا ہو۔ لیکن اگر بیوی سے عہدِ نکاح توڑ دیا جائے (یعنی طلاق دیدی جائے) تو اس سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ دادا اور پوتا نسبی رشتے دار ہیں۔ بکر زندہ ہے تو مرگیا ہے تو، حامد بہرحال زید کا پوتا ہے۔ بہو اور خسر کا یہ رشتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے بہو اور خسر کی مثال سے دادا اور پوتے پر دلیل لانا یکسر غلط ہے۔

اب آگے بڑھیے۔ مودودی صاحب کا یہ سوال سرے سے غلط ہے کہ کوئی شخص کسی واسطے سے، متوفی کے مال میں حقدار ہوتا ہے، مثلاً (نقشے میں دیکھیے) زید کی موت پر (مودودی صاحب کے پیش کردہ مسلک کے مطابق) عمر کو زید کے ترکے سے ایک ہزار روپیہ ملا۔ رشید کا اس ہزار روپے میں ایک پائی کا بھی حصہ نہیں۔ عمر کے مرنے پر رشید، عمر کے مال کا حقدار ہوگا۔ اگر عمر نے اپنی زندگی میں وہ ہزار روپیہ خرچ کردیا جو اسے زید کے ترکے میں ملا تھا تو رشید کے حصے میں اس ہزار روپے میں سے پھر بھی کچھ نہیں آئے گا۔ لہٰذا یہ اصول ہی غلط ہے کہ رشید عمر کے واسطے سے زید کے مال میں حقدار ہوتا ہے۔ اصول اس کے برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ کوئی شخص واسطے کی موجودگی میں کسی کے مال میں حقدار نہیں ہوتا۔ اس اصول کی وضاحت ذرا آگے چل کر آئے گی جہاں واسطے کی بجائے حجب کا لفظ استعمال کیا جائے گا جو اس فن کی صحیح اصطلاح ہے۔

قرآنی احکامِ وراثت میں ہے کہ

(i) للرجال نصیب مما ترك الوالدان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴/۷

(ii) یوصیکم الله فی اولادکم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴/۱۱

یعنی "اولاد" اپنے "والدین" کے ترکہ سے حصہ پاتی ہے۔ یہ حصہ خود خدا نے مقرر کر دیا ہے۔

ہمارے ہاں "اولاد" کے معنی عام طور پر صرف بیٹا، بیٹی سمجھے جاتے ہیں اور والدین کے معنی صرف ماں باپ۔ لیکن ان الفاظ کے معنی وسیع ہیں۔ ولد میں بیٹا اور بیٹے کی اولاد در اولاد (پوتا، پرپوتا وغیرہ) سب شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح والد میں باپ اور باپ کے والد در والد (دادا، پردادا وغیرہ) سب شامل ہوتے ہیں۔ اس اصول کو فقہ میں بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ اولاد میں نیچے تک اور والدین اوپر تک سب شامل ہوتے ہیں۔

یہاں سے دوسرا سوال پیدا ہوا۔ مثلاً ایک شخص مر گیا۔ اس کا باپ، دادا، پردادا بھی موجود ہیں اور بیٹا، پوتا، پرپوتا بھی۔ قرآن نے باپ کا حصہ بھی مقرر کیا ہے اور بیٹے کا بھی۔ لیکن جب "والد" کے اندر اوپر تک (دادا، پردادا) شامل ہیں اور "ولد" کے اندر نیچے تک (پوتا، پرپوتا) تو پھر ترکہ کی تقسیم کس طرح ہو؟ اس کیلئے قرآنی اصول اَقرب کا ہے۔ اقرب کے معنی ہیں وہ شخص جس کے اور میت کے درمیان کوئی اور موجود نہ ہو۔ مثلاً

نور (دادا)
↑
بشیر (والد)
↑
متوفی —— احمد (متوفی)
↓
خالد (بیٹا)
↓
نذیر (پوتا)

متوفی (احمد) سے اوپر کی طرف، متوفی کا باپ (بشیر) نور اور احمد کے درمیان روک (یا پردہ یا حجب) ہے۔ اس لئے احمد، نور کا اقرب نہیں ہے اسی طرح نیچے کی طرف، خالد (بیٹا) احمد اور نذیر کے درمیان روک ہے۔ اسلئے احمد نذیر کا اقرب نہیں ہے۔ اس صورت میں احمد کے ترکے میں اوپر کی طرف بشیر اور نیچے کی طرف خالد حقدار ہوں گے۔ لیکن اگر احمد کی وفات کے وقت بشیر زندہ نہ ہو۔ تو احمد، نور کا اقرب ہو جائیگا اور جو حصہ بشیر کا تھا وہی حصہ نور کا ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر احمد کی وفات کے وقت خالد زندہ نہ ہو تو احمد، نذیر کا اقرب ہو جائیگا اسلئے جو حصہ خالد کا تھا وہی حصہ نذیر کا ہو جائے گا۔

اب پھر صفحہ ۱۶ کے نقشے کو دیکھئے۔ زید کی وفات کے وقت ایک طرف رشید اور زید کے درمیان عمر کی روک موجود ہے اس لئے زید کے ترکے میں عمر کی موجودگی میں رشید حصہ دار نہیں ہو سکتا۔ لیکن دوسری طرف حامد اور زید کے درمیان کوئی روک نہیں (جو روک تھی ــــ یعنی بکر ــــ وہ پہلے ہی اٹھ چکی ہے) اس لئے حامد، زید کے ترکے میں حقدار ہے اور قرآن نے (ایسی صورت میں) جو حصہ ولد کے لئے مقرر کیا ہے

وہ اسے ملے گا۔ اسی طرح حامد کی موت کی صورت میں حامد کے مال سے زید کو وہ حصہ ملے گا جو قرآن نے والد کے لئے مقرر کیا ہے۔ کیونکہ اب حامد اور زید کے درمیان کوئی روک نہیں۔ (روک ۔۔ بکر ۔۔ پہلے اٹھ چکی ہے)۔ اسی طرح، اگر عمر بھی زید کی زندگی میں مر چکا ہوتا تو رشید، زید کے مال سے اپنا حصہ لیتا کیونکہ اس صورت میں رشید اور زید کے درمیان کوئی روک نہ ہوتی۔

اس سے واضح ہے کہ

(۱) والدین اور اولاد کے جو حصے قرآن نے مقرر کئے ہیں وہ صرف ماں باپ اور بیٹی بیٹے کے حصے نہیں بلکہ اوپر تک اور نیچے تک مسلسل جاتے ہیں۔

(۲) حصہ اسی کو ملتا ہے جس کے اور متوفی کے درمیان کوئی حجاب (یا روک) نہ ہو۔ جب روک اٹھ جائیگی تو حصہ مل جائیگا۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کا اصول، کس طرح قرآنی اصول کی نقیض ہے۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ بیوہ بہو کو خسر کے مال سے کیوں حصہ نہیں ملتا۔ اس لئے کہ خسر کے مال میں بہو کا حصہ قرآن نے مقرر ہی نہیں کیا۔ اسلئے اس کے شوہر کی موجودگی یا اس کی وفات اس سوال پر اثر انداز ہی نہیں ہوتی۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ تم زید کے مرنے پر، اس کے فوت شدہ بیٹے، بکر کا حصہ نکال کر حامد کو دیتے ہو، اور یہ غلط ہے۔

لیکن ہم پوچھتے یہ ہیں کہ بکر کا حصہ نکالتا کون ہے؟ (حصہ صرف اس کا ہوتا ہے جو متوفی کی وفات کے وقت زندہ موجود ہو ۔۔ مُردوں کے حصے کوئی نہیں نکالتا)۔ قرآن کی رُو سے، حامد، اپنے دادا (زید) کے ترکے میں حقدار ہے اس لئے حامد کو خود اس کا حصہ ملتا ہے نہ کہ اس کے متوفی باپ (بکر) کا حصہ۔ اگر بکر کا حصہ نکلتا تو اس کی بیوہ کو بھی کچھ مل جاتا۔ لیکن جب بکر کا حصہ ہی نہیں تو بیوہ یا بکر کے اور رشتہ داروں کو کیا ملے گا؟ پھر سن رکھئے کہ حامد کو براہ راست (زید کے ترکے سے) اپنا حصہ ملتا ہے نہ کہ اپنے متوفی باپ (بکر) کا حصہ۔

ان تصریحات کے بعد آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ ہمارے ملا کا یہ مذہب کہ یتیم پوتا، اپنے دادا کی میراث سے حصہ نہیں پا سکتا، کسطرح قرآن کی کھلی ہوئی مخالفت ہے اور ملا کے اس مسلک کی تائید میں مودودی صاحب کے دلائل کی حیثیت کیا ہے؟

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ "رہا یتیم کا سوال، تو شریعت کی رو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کی پرورش کا انتظام کریں۔" یعنی، قرآن نے اس یتیم کا جو حصہ مقرر کیا ہے اس سے اسے محروم کر دیا جائے (اور وہ حصہ اس کے چچا کو دلا دیا جائے) اور پھر اس محروم و یتیم کو خیرات کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرنے کیلئے مجبور کر دیا جائے۔ دوسری طرف اس کے چچا کو اس کی جائداد کا مالک بنا کر اس سے اپیل کی جائے کہ اس یتیم کی پرورش کرو۔ اللہ تمہیں اس کی جزائے خیر دیگا۔ قرآن میں یہودیوں کے متعلق آیا ہے کہ وہ پہلے اپنے بھائیوں کو دشمن کے حوالے کر دیتے تھے اور پھر انہیں فدیہ دیکر چھڑاتے تھے تاکہ اس سے ثواب حاصل ہو۔ اسی قسم کا انتظام یہ حضرات یتیم پوتے کے لئے کرتے ہیں۔

مودودی صاحب نے ضمناً وصیت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ۔۔ لکھتے ہیں کہ "۱/۳ حصہ مال کی حد تک وہ وصیت کر سکتا ہے۔"

یہ چیز بھی قرآن کریم کی کھلی ہوئی مخالفت ہے۔ قرآن نے وصیت کا پورا پورا حق دیا ہے اور کہیں یہ نہیں لکھا کہ وصیت صرف ⅓ حصہ مال میں ہوسکتی ہے۔ اللہ نے وصیت کے حکم میں کہیں یہ نہیں کہا کہ وصیت صرف ⅓ حصہ میں ہوسکتی ہے۔ لیکن ملا کہتا ہے کہ نہیں! تم وصیت صرف ⅓ حصہ تک کرسکتے ہو۔ یعنی (معاذ اللہ) خدا کو اتنی بات بھی نہیں کہنی آتی تھی کہ وصیت ⅓ حصہ میں کی جاسکتی ہے[1]۔ وہ اس کیلئے بھی روایات کا محتاج ہوگیا۔ یہ ہے ملا کا روایاتی مذہب!!

جب ہم کہا کرتے ہیں کہ ملا کا مذہب بالکل نوایجاد ہے اور قرآن سے اسے کچھ تعلق نہیں تو بعض (ناواقف) حضرات کو اس سے بڑی حیرت ہوتی ہے اور وہ اسے صحیح تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ اب آپ صرف اس ایک مسئلہ میں دیکھ لیجئے (یعنی یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے میں) کہ قرآن کا حکم کیا ہے اور ملا کا مذہب کیا! اس کے بعد آپ خود سوچ لیجئے کہ جس چیز کو ملا "نظام شریعت" کہہ کر پکارتا ہے اُسے قرآن سے کسقدر تعلق ہوگا! ہزار برس سے مُلا اپنے اس غیر قرآنی مذہب کو لئے ہوئے آرہا ہے۔ نمعلوم اس سے کسقدر یتیم پوتے، محروم الارث ہوکر تباہ و برباد ہوئے ہوں گے۔ ہماری بدبختی کہ اب یہی غلط مذہب، ملک کا قانون بن گیا ہے۔ نمعلوم اب کسقدر مظلوم یتیم ہوں گے جو مُلا کی اس کند چھری سے ذبح ہوچکے ہوں گے اور آئندہ ذبح ہوں گے۔

بات تو اتنی ہی ہے جسے ہم اوپر لکھ چکے ہیں لیکن مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے ہم اس مضمون کو بھی دہرا دینا چاہتے ہیں جو اس سے قبل طلوع اسلام (بابت جون ۱۹۴۹ء) میں شائع ہوچکا ہے۔ وھو ہذا۔

یتیم پوتے کا حصہ

کچھ عرصہ سے ہمارے پاس قرآن کریم کے قانونِ وراثت سے متعلق بہت سے استفسارات پہنچ رہے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں سوال یہ پوچھا جارہا ہے کہ ہمارا مروجہ فقہی قانون جس کی رو سے یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے محروم کردیا جاتا ہے قرآن کی رو سے کیسا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنی چار مختصر سی آیات میں پورے کا پورا قانونِ وراثت جس حسن و خوبی اور جامعیت و اکملیت کے ساتھ بیان کردیا ہے، جب نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو انسان، قرآن کے اس اعجاز پر وجد کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن جب اس کی نگاہ اس قانون پر پڑتی ہے جو ہمارے فقہا نے مرتب کیا ہے اور جو ہزار سال سے

---

[1] کہا جاسکتا ہے کہ جب قرآن میں وراثت کے حصے مقرر ہوچکے ہیں تو پھر وصیت کا سوال کیسے پیدا ہوسکتا ہے۔ سو قرآن نے وراثت کے احکام کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے (اور اسے بار بار دہرایا ہے کہ) یہ حصے وصیت پوری کرنے اور قرضہ ادا کردینے کے بعد عمل میں آئیں گے۔ (من بعد وصیۃ یوصی بھا او دین)۔ یعنی وصیت کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ پورا مال وصیت سے (COVER) نہ ہوتا ہو۔ یا ایسی صورت پیدا ہوجائے کہ انسان وصیت نہیں کرپایا اور اس کی موت واقع ہوگئی تو پھر تقسیم مال قرآنی حصوں کے مطابق ہوگی۔ یہ قانون کسقدر انسانیت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اس کے متعلق کسی اور وقت لکھا جائے گا۔

مسلمانوں میں مروج چلا آرہا ہے تو وہ ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ کس قسم کا قانون ہے! اس مروجہ قانون میں نہ صرف یہ کہ باہمدگر متضاد شقیں موجود ہیں بلکہ اس میں قرآنی اصولوں کی صریح مخالفت بھی ہے۔ جنہیں قرآن وارث قرار دیتا ہے یہ قانون انھیں وراثت سے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن ان کے لئے کچھ حصہ مقرر کرتا ہے یہ قانون اس کے خلاف کچھ اور ہی دیتا ہے۔ کہیں ایک ہی درجہ کے دو رشتہ داروں میں ایک وارث قرار پا جاتا ہے دوسرا محروم رہ جاتا ہے اور سب سے بڑی افسوسناک صورت یہ کہ اس قانون کی روسے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ (معاذ اللہ) خدا چوتھی جماعت کے بچوں جتنا بھی حساب نہیں جانتا۔ اس اصول کو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ جب کسی چیز کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے تو تمام حصوں کی حاصل جمع ایک (۱) آنی چاہئے۔ اگر حاصل جمع ایک نہیں آتی تو ریاضی کے ابتدائی قاعدے کی روسے یہ تقسیم غلط ہے۔ مثلاً ($\frac{1}{2}+\frac{1}{4}+\frac{1}{4}=1$) یہ تقسیم درست ہے۔ لیکن ($\frac{1}{2}+\frac{1}{2}+\frac{1}{3}=\frac{4}{3}$) یہ تقسیم غلط ہے کیونکہ ان حصوں کا مجموعہ (۱) نہیں بلکہ ($1\frac{1}{3}$) ہے۔

یہ ہے بہر حال وہ قانونِ وراثت جسے ہم بڑے فخر سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ اس سے ہم ایک طرف اللہ تعالیٰ کے متعلق کیا تصور پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف کس طرح علمی دنیا میں اپنے آپ کو اضحوکہ بناتے ہیں لیکن "مسلمانوں" کو اس کیا غرض کہ ان کے کسی عمل سے خدا کے متعلق کیا تصور پیش ہوتا ہے اور دنیائے علم و بصیرت میں ان کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے۔ انھیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے بس اسی طرح ہوتا چلا جائے اور جو شخص اس کے خلاف ذرا سی آواز بلند کرکے انھیں کہے کہ آؤ ہم اپنی روش کو اللہ کی کتاب کے مطابق کرلیں، اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے۔

اس مختصر سی تمہید سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہمارا مروجہ قانونِ وراثت پورے کا پورا ایسا ہے کہ قرآن کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے اور اس کی جگہ اس قانون کو رائج کیا جائے جو خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے۔ اس وقت ہم اس قانون کے اس ایک گوشے کو سامنے لائیں گے جس کے متعلق نمایاں طور پر استفسارات موصول ہوئے ہیں یعنی یتیم پوتے کی وراثت کا سوال۔

قانونِ وراثت چونکہ ایک فنی (Technical) مسئلہ ہے اسلئے اسے سمجھنے کیلئے ذرا دقتِ نظر کی ضرورت ہوگی۔ ہم کوشش کرینگے کہ اس کی فنی اصطلاحات سے بچ کر عام فہم اور سلیس انداز میں اسے پیش کریں لیکن اس کے باوجود آپ کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ اسے یونہی رواں نہ پڑھتے جائیں بلکہ ایک ایک ٹکڑے کو سمجھ کر آگے بڑھیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اصل مسئلہ ہے کیا۔ یہ اس طرح سے سمجھ میں آجائے گا۔

زید

بکر (زید کی زندگی میں فوت ہوگیا) — عمر (زید کی وفات کے وقت زندہ ہے)

خالد (زندہ ہے) — حامد (زندہ ہے)

خالد اور حامد دونوں زید کے حقیقی پوتے ہیں۔ خالد، یتیم ہے۔ حامد کا باپ زندہ ہے۔ زید کی وفات پر اس کی جائیداد کی تقسیم کا سوال پیش آتا ہے

ہمارا فقہی قانون وراثت کہتا ہے کہ اس جائداد میں خالد (جو یتیم ہے) کچھ حصہ نہیں پائے گا۔ جائیداد عمر کو ملے گی (اور اس کی وساطت سے اس کے بیٹے حامد کو)۔ اگر محض عقل عامہ کی رو سے بھی دیکھا جائے تو یہ فیصلہ سراسر ناانصافی پر مبنی دکھائی دیگا۔ خالد یتیم ہے۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں۔ لیکن یہی اس کا جرم قرار دیدیا جاتا ہے اور اس طرح اسے اپنے باپ دادا کے ترکہ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو وہ برابر کا حصہ لیتا۔ وہ مر چکا ہے اس لئے اب خالد کو کچھ نہیں مل سکتا۔ اس کا چچا جائیداد کا وارث ہوگا۔

اب آیئے اس طرف کہ ہمارے فقہا اس کے لئے دلائل کیا پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں ان کی دو دلیلیں اہم ہیں۔

(۱) وہ کہتے ہیں کہ جو شخص، مرنے والے کے ساتھ، کسی دوسرے شخص کے واسطے سے رشتہ رکھتا ہے تو وہ شخص اس واسطہ کی موجودگی میں ترکہ نہیں پا سکتا۔ یعنی خالد کا رشتہ اپنے دادا زید کے ساتھ، اپنے والد بکر کے واسطے سے ہے براہ راست نہیں۔

ٹھیک ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ بکر تو مر چکا ہے اسلئے اب خالد اپنے مرحوم باپ کا قائم مقام ہے اور اس کے اور اس کے دادا (زید) کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کا چچا (عمر) درمیان میں واسطہ نہیں بن سکتا اس لئے کہ خالد کا اپنے دادا سے رشتہ، اپنے چچا عمر کے واسطہ سے نہیں ہے، اپنے باپ کے واسطے سے تھا اور یہ واسطہ اب درمیان سے نکل چکا ہے۔

اس مقام پر یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ہمارے فقہا خود اپنے وضع کردہ اصول پر بھی قائم نہیں رہتے۔ وہ خالد کو اپنے دادا (زید) کی وراثت سے تو محروم کرتے ہیں لیکن اگر زید کی زندگی میں خالد مر جائے تو اس کی جائیداد زید کو دیدیتے ہیں۔ یعنی دادا تو یتیم پوتے کا براہِ راست رشتہ دار ہوتا ہے لیکن وہی پوتا اپنے دادا کا براہِ راست رشتہ دار نہیں ہوتا۔

اب ان کا دوسرا اصول لیجئے۔ دراصل یہ دوسرا اصول ہی وہ محکم اصول قرار دیا جاتا ہے جس کی رو سے یتیم پوتا، وراثت سے محروم کر دیا جاتا ہے یہ اصول ہے۔

الاقرب فالاقرب۔ یعنی قریب کے رشتہ دار کے ہوتے ہوئے بعید کا رشتہ دار محروم رہتا ہے۔

(دادا اور پوتے والی مثال میں) چونکہ عمر (زید کا بیٹا ہونے کی جہت سے) زید کا قریب کا رشتہ دار ہے اس لئے خالد (جو پوتا ہونے کی جہت سے زید کا بعید کا رشتہ دار ہے) عمر کی موجودگی میں محروم رہ جائے گا۔

زید

بکر (قریب کا رشتہ دار) — عمر (قریب کا رشتہ دار)

خالد (عمر کی موجودگی میں زید کا بعید کا رشتہ دار)

اول تو یہ سن لیجئے کہ ہمارے فقہا، خود اپنے اس اصول پر بھی قائم نہیں رہتے۔ اصول یہ ہے کہ

قریب کے رشتہ دار کی موجودگی میں بعید کا رشتہ دار محروم رہ جاتا ہے۔

مثلاً رشید کا انتقال ہوگیا۔ اس کا دادا بھی موجود ہے اور بیٹا بھی۔ ظاہر ہے کہ بیٹا قریب کا رشتہ دار ہے اور دادا بعید کا۔ لہٰذا اس کے بیٹے

کی موجودگی میں اس کے دادا کو کچھ نہیں ملنا چاہئے۔ لیکن ہمارے فقہا دادا کو حصہ دیتے ہیں اور اس طرح خود اپنا قائم کردہ اصول بھی قائم نہیں رہنے دیتے۔

اب آئیے اس اصول کی طرف۔ اس اصول کو اس آیت سے مستنبط کیا جاتا ہے۔

للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منہ او اکثر نصیبا مفروضا (۴/۷)

مردوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو والدین اور اقربا نے چھوڑا ہے اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو والدین اور اقربا نے چھوڑا ہے خواہ ترکہ تھوڑا ہو یا بہت۔ ایک معین حصہ (جو بعد میں بیان کیا گیا ہے)

یہ آیت میراث کے قانون کی تمہید ہے۔ ہم اس وقت اس عظیم اصول کی تشریح میں نہیں جانا چاہتے جو اس قانون میں بیان کیا گیا ہے۔ نہ ہی اس میں کہ جب والدین خود اقربا میں شامل ہیں تو ان کا الگ ذکر کیوں کیا گیا۔ یہ نکات اپنے مقام پر سامنے آئیں گے۔ اس وقت صرف نقطہ زیر نظر مرکوز رہنا چاہئے۔ آیت میں اقربون آیا ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ چونکہ رشتہ دار قرابت کے لحاظ سے بہت سے قریب اور بعید ہوتے ہیں، مثلاً والدین، اولاد، اولاد کی اولاد، بھائی، بہن، چچا، پھوپھی وغیرہ۔ اور یہ ممکن نہیں کہ سب کے سب خواہ قریب ہوں یا بعید، ایک ساتھ وارث ہوں، اس لئے وراثت کا مدار قربیت پر ہے۔ یعنی میت کے ترکہ میں سے اسی کو حصہ ملے گا جس کا وہ (مرحوم) اقرب ہوگا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اقربا جو چھوڑ کر مریں اس میں سے مردوں اور عورتوں کو حصہ ملے گا۔ یہ نہیں کہا کہ میت کے اقربین کو حصہ ملے گا۔ یہ فرق بڑا نازک ہے اور اس کو نظر انداز کر دینے سے تدوین فقہ کے وقت یہ اصول بنایا گیا کہ میت کا قریبی رشتہ دار اپنے سے دور کے رشتہ دار کو محروم کر دیتا ہے اور اس اصول کی بنا پر یتیم پوتے کو، مرنے والے کے بیٹے کی موجودگی میں وراثت سے محروم کر دیا۔

یہ فرق چونکہ بڑا نازک ہے اسلئے اسے اور وضاحت سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تمہارے اقرب جو چھوڑ کر مریں اس کی تقسیم یوں ہوگی۔ یعنی دیکھنا یہ ہوگا کہ مرنے والا اپنے زندہ رشتہ داروں میں سے کس کس کا اقرب تھا۔ اقرب کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اور میت میں کوئی درمیانی واسطہ موجود نہ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ زندہ رشتہ داروں میں سے جو میت کا سب سے قریبی ہو اس کو حصہ ملے گا، جو اس سے دور کا رشتہ دار ہو اسے حصہ نہیں ملے گا۔ ہر اقرب کو حصہ ملے گا۔ یعنی ہر اس رشتہ دار کو جس کے اور میت کے درمیان کوئی واسطہ موجود نہ ہو۔ مثلاً

سعید ———— کریم کا دادا زندہ ہے۔

رحیم ———— کریم کا والد فوت ہو چکا ہے۔

کریم ———— اس کی وفات ہوئی ہے۔

رشید ———— کریم کا بیٹا زندہ ہے۔

کریم کا قریب ترین رشتہ دار رشید ہے (بیٹا جو بلاواسطہ رشتہ دار ہے) سعید کریم کا دادا) کریم کا بالواسطہ رشتہ دار ہے۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ قریب ترین کی موجودگی ہیں، اس سے بعید رشتہ دار محروم ہو جاتا ہے تو رشید کی موجودگی میں، سعید کو محروم ہو جانا چاہئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ رحیم کی وفات کے بعد سعید اور رشید دونوں کریم کے اقرب ہو گئے۔ اوپر کی طرف کریم اور سعید کے درمیان کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اور نیچے کی طرف کریم اور رشید کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ لہٰذا اقرب کے معنی ہوئے وہ رشتہ دار جس کے اور متوفی کے درمیان، متوفی کی وفات کے وقت کوئی واسطہ موجود نہ ہو۔ جب صورت یہ ہے تو پھر پہلی مثال کو سامنے لائیے۔

زید

بکر (وفات پا چکا ہے) — عمر (زندہ ہے)

خالد (زندہ ہے) — حامد (زندہ ہے)

جس طرح اوپر کی مثال میں رحیم کی وفات سے سعید اور کریم اقرب (براہ راست رشتہ دار) ہو گئے تھے اسی طرح بکر کی وفات سے زید اور خالد اقرب (براہِ راست رشتہ دار) ہو گئے ہیں۔ اور براہ راست رشتہ دار (اقرب) وارث ہوتا ہے۔ لہٰذا خالد کو زید کے ترکہ میں سے حصہ ملے گا۔ حامد کو نہیں ملے گا، کیونکہ اس کے اور زید کے درمیان عمر موجود ہے۔ اگر عمر بھی فوت ہو چکا ہوتا تو پھر خالد کی طرح حامد کو بھی حصہ مل جاتا۔

وراثت کے قانون میں ایک چیز کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہئے اور وہ ہے قائم مقامی۔ باپ کی وفات سے بیٹا اس کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ بکر کی وفات سے خالد نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ وراثت کا سارا دارومدار قائم مقامی پر ہے۔ درمیانی واسطہ اٹھ جانے سے بعید کا رشتہ دار، درمیانی واسطہ کا قائم مقام اور اس طرح میت سے اقرب ہو جاتا ہے، اور قرآن کے حکم کے مطابق، مرنے والا (مورث) جن لوگوں کا اقرب ہو گا وہ لوگ وراثت پائیں گے۔ فقہا نے اقرب کا استعمال ورثہ (زندہ رشتہ داروں) کے لئے کیا جس سے بہت سی غلطیوں میں پڑ گئے۔ قرآن کے بیان کردہ اصول کے بعد ہم کو صرف یہ متعین کرنا تھا کہ میت کس کس کا اقرب ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی قاعدہ بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ فقہ نے لفظ اقرب کی نسبت بھی غلطی کی اور پھر جو قواعد اس پر متفرع کئے ان پر عمل کرنا ناممکن ہو گیا جس کی وجہ سے کہیں خود اپنے بنائے ہوئے قواعد کے خلاف چل نکلے اور کہیں قرآن کے بھی خلاف۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ ہمارے فقہا رحمہم اللہ نے دانستہ ایسا کیا۔ ہر انسان کے تفقہ میں غلطی کا امکان ہے۔ اس لئے قصور ان کا نہیں۔ اصل قصور ہے اس ذہنیت کا جس کی رو سے یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ اسلاف میں سے جو کچھ کسی نے کہہ دیا ہے وہ منزل من اللہ کی طرح تنقید کی حد سے بالا ہے اس لئے اس کے متعلق کسی پس آئندہ کا سوچنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ہمیں اپنے اسلاف کی فکر کے نتائج پر آنکھیں بند کر کے چلتے جانا چاہئے۔ یہی اسلاف پرستی اس قوم کو لے ڈوبی۔ ابھی ایک مسئلہ وراثت کو لیجئے۔ قرآن نے وصیت کا حکم دیکر انفرادی مصالح کی حفاظت کا پورا پورا سامان کر دیا تھا۔ فقہ اور روایات نے وصیت کو ممنوع قرار دیکر ان تمام مصالح کو ختم کر دیا۔ جس سے عجیب عجیب قسم کی الجھنیں پیدا ہو گئیں۔ پھر قانونِ وراثت میں تفقہ کی غلطیوں نے قرآنی قانون کو کچھ سے کچھ بنا دیا جس سے کروڑوں

جائز وارث اپنے آبا واجداد کی جائدادوں سے محروم ہوگئے۔ اگر اسلاف پرستی نہ ہوتی تو ایک ایک کی اجتہادی غلطی کی گرفت دوسرا کرلیتا اور اس طرح اس کے نقصانات آگے نہ بڑھتے۔ اس ایک مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قانون اسلامی کا مدار قرآن پر ہونا چاہئے تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے۔ آپ اندازہ فرمائیے کہ اگر ہم نے اس فیصلہ کے بعد کہ ہماری حکومت کا آئین اسلامی ہونا چاہئے، آئین وقانون سازی کا کام ان کے سپرد کردیا جن کا عقیدہ ہے کہ فقہ اور روایات میں جو کچھ لکھا چلا آرہا ہے وہ وحی منزل کی طرح منزہ عن الخطاء ہے اور ہمیں اس پر تنقید کا کوئی حق نہیں، تو ان کا وضع کردہ آئین وقانون کس حد تک قرآنی ہوسکتا ہے؟ قرآنی آئین و شریعت صرف قرآن سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ جب ہم قرآن سے باہر جائیں گے تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں گے۔

وفیہا بصائر للناس

روزے کے احکام

(۱) جو تم میں سے رمضان کے مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو تو وہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ (فمن شهد منكم الشهر فليصمه - ۲/۱۸۵)

(۲) جو سفر میں ہو وہ واپسی پر روزے پورے کرلے (فعدة من ايام اخر - ۲/۱۸۴)

(۳) جو گھر پر ہو لیکن مریض ہو، وہ صحت یاب ہونے کے بعد روزے پورے کرلے (ایضاً)

(۴) مریض اسے کہتے ہیں جو عارضی طور پر بیمار ہوگیا ہو اور کچھ وقت کے بعد پھر اپنی صحت کی حالت پر آجائے۔ لیکن جو شخص مثلاً بڑھاپے کی وجہ سے ضعیف ہو رہا ہو۔ یا خلقی طور پر کمزور (CONSTITUTIONALLY WEAK) ہو۔ یا کسی ایسے عارضے میں مبتلا جس میں بھوک یا پیاس سے تکلیف ہوتی ہو اور عارضہ مستقل ہوچکا ہو۔ تو ایسے لوگ دوسرے وقت پر روزے پورے کرہی نہیں سکتے۔ ان کے متعلق حکم ہے کہ جو شخص روزہ بمشکل برداشت کرسکے" اُسے اختیار ہے کہ چاہے تو روزہ رکھ لے اور چاہے تو اسکے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلادے جیسی نئی جسمانی حالت دیکھے ویسا ہی کرے لیجئے دنیا بھر کے انسان ان چاروں شقوں میں آگئے۔ (وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين)

(۵) روزہ ہوتا کیا ہے؟ صبح سے رات تک کھانے پینے اور مباشرت سے اجتناب۔ (۲/۱۸۷)۔

(۶) یہ ہیں احکام (کتاب)۔ ان احکام سے مقصود کیا ہے؟ یہ کہ (ا) تم قانونِ خداوندی سے ہم آہنگی کے خوگر ہوجاؤ (لعلكم تتقون)۔ (ii) جس قانونِ خداوندی پر تم چل رہے ہو اسے دنیا میں نافذ کرکے اس کی بڑائی کا عملی ثبوت دو۔ (لتكبروا الله على ما هدٰكم) اور (iii) تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کریں (لعلكم تشكرون)۔ ظاہر ہے کہ یہ نتائج صرف قرآنی معاشرے کے اندر مرتب ہوسکتے ہیں۔

یہ ہے روزوں کی حکمت۔ (کتاب اور حکمت دونوں قرآن کے اندر)۔

محجوب الارث

(علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

[علامہ اسلم جیراجپوری نے یہ مضمون ۱۹۱۷ء میں لکھا تھا جب وہ ہنوز حدیث اور فقہ کو بھی دین سمجھتے تھے۔ یہ مضمون پہلے رسالہ معارف، اعظم گڑھ میں ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد الگ رسالہ کی شکل میں۔ چونکہ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ ایک عملی اہمیت رکھتا ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس مضمون کو (جو اس وقت نایاب ہو رہا تھا) شائع کر دیں تاکہ اس مسئلہ کے تمام گوشے نکھر کر سامنے آجائیں۔ طلوع اسلام]

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الامین وعلی جمیع المسلمین الی یوم الدین۔ اما بعد

اسلامی فقہ فرائض میں ایک مسئلہ محجوب الارث کا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جو بیٹا باپ کی زندگی میں اپنے بچوں کو چھوڑ کر مر جاتا ہے اس کی یتیم اولاد اپنے دادا کے مرنے پر بشرطیکہ اس نے کوئی اور بیٹا بھی چھوڑا ہو اس کے ترکہ میں سے حصہ نہیں پاتی۔ مثلاً اگر مورث نے بروقتِ وفات ایک بیٹا اور ایک یتیم پوتا چھوڑا تو اس صورت میں سارے ترکہ کا مورث بیٹا ہو گا۔ اور پوتا محجوب الارث یعنی وراثت سے محروم قرار دیا جائے گا۔ صورت یہ ہے :-

مثال

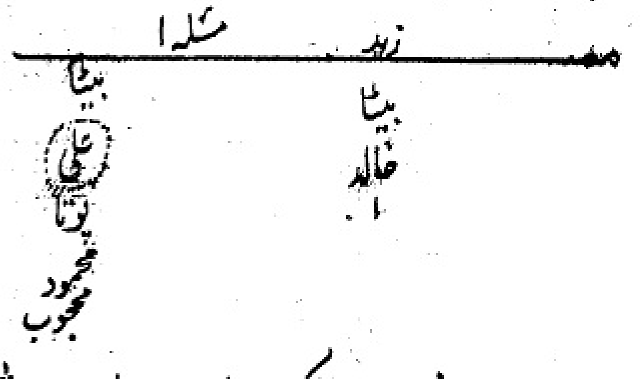

یہ حجب صرف اسی صورت میں محدود نہیں ہے بلکہ عصبات میں عام ہے۔ مثلاً ایک بھائی کی موجودگی میں دوسرے مردہ بھائی کی اولاد یا چچا کے ہوتے ہوئے چچا زاد بھائی بہن وغیرہ سب اسی قاعدے سے محجوب ہیں۔

اس مسئلہ کو فقہا نے اگرچہ ایک مقرر اور طے شدہ قانون بنا کر فقہ کی کتابوں میں لکھ دیا ہے۔ لیکن پھر بھی دیکھا جاتا ہے کہ عام طور پر مسلمان اس سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں۔ خاصکر جب دوسرے اہل مذاہب اعتراض کرتے ہیں اور قانونِ اسلام کو یتیموں کے خاندان سے خارج کرنے کا الزام دیتے ہیں تو ان کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے اور کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے۔

حال میں دو ایک قانون پیشہ اصحاب محجوب پوتے کی وکالت کے لئے اٹھے۔ بعضوں نے اس کی حمایت میں اخباروں میں مضامین بھی لکھے، قانون ساز مجلس میں بھی تحریک کی۔ لیکن قدامت پرست جماعت کے مقابلہ میں بہت جلد نوفل کی طرح جس نے مجنوں کو بیاہنے کیلئے

لیلیٰ کے قبیلہ پر چڑھائی کی تھی ناکام میدان سے ہٹ گئے اور بیچارہ پوتا کہتا رہ گیا:

ہم دل میں خوش کہ سبزۂ تربت ہرا ہوا — وہ اس ادا سے روئے کہ پلکیں بھی نم نہیں

میرے دل میں ابتداہی سے جب سے میں نے فنِ وراثت کی تعلیم پائی یہ مسئلہ برابر کھٹکتا تھا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے ایک پھوپھی زاد بھائی حافظ عبدالاعلیٰ مرحوم جن کو بچپن ہی سے میرے ماں باپ نے تربیت اور تعلیم میں میرا ہمزاد بنا رکھا تھا اسی مسئلہ کا شکار تھے شیرخوارگی ہی کے زمانے میں ان کے والدین انتقال کر گئے تھے۔ لیکن دادا زندہ تھے۔ اور ان کے اور بیٹے بھی تھے۔ بعد میں اگرچہ ان کے نیک دل دادا نے ان کی وراثت کیلئے باقاعدہ وصیت نامہ لکھدیا لیکن برادر مرحوم کی جواں مرگی نے ان سب جھگڑوں کا خاتمہ کردیا۔

میری توجہ اسی زمانے سے اس مسئلہ کی طرف لگی رہی اور متعدد دلائل سے میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ یہ مسئلہ مغزو منشائے اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن یہ سوچکر کہ ممکن ہے میری فہم نے غلطی کی ہو ایک عرصۂ دراز تک ہندوستان کے مختلف اہل علم سے جو اس فن سے آشنا تھے اس مسئلہ کے متعلق خط و کتابت کرتا رہا۔ جو مل گیا اس سے زبانی گفتگو کی۔ یہ سب لوگ میرے دلائل کے جوابات سے قطعاً قاصر رہے جس سے صاف روشن ہوگیا کہ یہ مسئلہ فقہ کی ایک ناقابل قبول غلطی ہے جس کی تقلید کسی طرح روا نہیں۔

اس بنیاد پر ۱۹۱۸ء میں میں نے اس بحث کو قلمبند کیا اور رسالہ معارف اعظم گڑھ کے جولائی اور اگست کے دو نمبروں میں شائع کرادیا۔

صحیح الخیال علماء اور قانون پیشہ اصحاب جن کو رات دن معاملات سے واسطہ پڑتا ہے، میرے ساتھ موافقت کی اور صرف وہ لوگ جو فقہائے سابقین کے مقلد ہیں اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے اور ان کو ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ وہ ان کے دفاتر میں کسی غلطی کے قائل نہیں کہ اس کی تحقیق کریں اور جو قائل بھی ہیں تو اس زمانہ میں اس کی اصلاح ناممکن سمجھتے ہیں۔

محجوب الارث کا مسئلہ کوئی فرضی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اکثر مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔ میرے پاس چونکہ فرائض کے سوالات بہت آتے ہیں اس وجہ سے اس مسئلہ سے بھی کبھی کبھی واسطہ پڑجاتا ہے۔

بعض دفعہ تو ایسی دردناک صورت پیش آگئی ہے کہ باپ کے سامنے وہی بیٹا اپنا کوئی معصوم بچہ چھوڑ کر مر گیا ہے جو اس کے بیٹوں میں سب سے زیادہ لائق اور خدمتگزار تھا۔ جس نے باپ کی خوب خدمت کی اور اپنی کمائی سے اس کو غنی کردیا اور دوسرا بیٹا جو موجود ہے وہ نہایت نالائق اور ناکارہ ہے۔ پھر دادا کے مرنے کے بعد وہ یتیم بچہ جو اپنے باپ کے ظل عاطفت سے پہلے ہی محروم ہوچکا تھا اب اس کی پیدا کی ہوئی دولت سے بھی محروم ہوجاتا ہے اور سارا ترکہ وہی ناکارہ اور آوارہ بیٹا لے لیتا ہے۔

میرے ایک دوست جو علی گڑھ میں نامور وکیل ہیں۔ ان کے یہاں ایک عورت چھوٹے چھوٹے چار بچوں کو نہایت خستہ اور تباہ حالت میں لئے ہوئے آئی اور رو رو کر اپنی دردبھری کہانی سنائی کہ سال گذشتہ طاعون میں میرا شوہر مرگیا، اب حال میں ان بچوں کا دادا بھی گذر گیا۔ ان کا ایک چچا ہی ہے جو نہایت نالائق اور آوارہ ہے، اس نے مجھے بچوں سمیت گھر سے نکال دیا، میرا میکہ اس قابل نہیں ہے کہ ان کو لیکر وہاں گزر کرسکوں، آپ وکیل ہیں۔ اللہ کے واسطے میری کچھ مدد فرمائیے اور بچوں کے دادا کی جائیداد میں سے جو بہت بڑی ہے عدالت سے چارہ جوئی کرکے کچھ ان کو دلائیے۔

وکیل صاحب کو رقت تو بہت آئی لیکن پھر اس کے کیا جواب دے سکتے تھے کہ افسوس ہے کہ تمہارے بچوں کو اسلامی قانون وراثت کی رو سے کچھ نہیں مل سکتا اس لئے عدالت میں دعویٰ کرنا فضول ہے۔

آخر وہ بیچاری باچشم تران نیم مردہ معصوموں کو لیکر واپس چلی گئی۔

جب اس قسم کی پیش آنے والی کوئی صورت نظر پڑتی ہے تو لوگ یہ کوشش[1] کرتے ہیں کہ دادا اپنی زندگی میں محجوب اولاد کو کچھ دیدے کیونکہ چچاؤں سے امید کم ہوتی ہے اور چونکہ فطرت نے اولاد پر شفقت کرنے کا مادہ انسان میں رکھا ہے، اس لئے اکثر حالتوں میں دادا راضی ہو جاتے ہیں اور ان یتیموں کا تبرعاً و احساناً اپنے مال میں سے کچھ حصہ دیدیتے ہیں۔

لیکن بعض سخت دل ایسے بھی ہوتے ہیں جو صاف صاف کہدیتے ہیں کہ صاحب جب ان کو اللہ نے نہیں دیا تو ہم دینے والے کون؟ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قانونِ وراثت کے مکمل ہونے کا دعویٰ جو کیا جاتا ہے وہ کہاں تک بجا ہے کہ ایک بیکس و یتیم بچہ اپنے بزرگوں کی زندگی بھر کی کمائی سے محروم ہو رہا ہے اور کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی۔

اسلئے کہ ایک طرف تو قانون وراثت اس کو محجوب الارث قرار دیتا ہے اور دوسری طرف فقہ دادا کے اوپر اس کے لئے کوئی وصیت بھی فرض نہیں کرتی

اس صورت کو پیش نظر رکھکر یہ بھی سوچنا چاہئے کہ یہ قانون اس شفقت کے کہانتک مطابق ہے جو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنی چاہتا ہے؟ اسلام تو سراسر رحم و مہربانی ہے، ہمارے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم دنیا والوں کیلئے رحمت اور بالخصوص یتیموں اور بیکسوں کیلئے شفیق والدین سے بڑھ کر تھے، آپ دنیا میں خود یتیم پیدا ہوئے تھے اور ابتداہی سے یتیموں سے اسقدر محبت اور الفت رکھتے تھے کہ جب مکہ معظمہ کی گلیوں سے گزرتے تھے تو یتیم بچے اپنی دولت سمجھ کر دوڑ دوڑ کے قدموں سے لپٹ جاتے تھے۔

چنانچہ آپ کے چچا نے آپ کی مدح میں جو اشعار کہے تھے ان میں سے ایک شعر یہ تھا۔

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ ثمال الیتامی عصمۃ للارامل

ترجمہ: نورانی چہرہ والا جس کی برکت سے باران طلب کی جاتی ہے، یتیموں کا سرپرست اور بیواؤں کا نگہبان۔

تقریباً اسی مضمون کو مولانا حالی مرحوم نے اس بند میں باندھا ہے۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کی کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ یتیموں کا والی، غریبوں کا مولیٰ

کسی دوسرے ملک میں شاید یہ قانون اس قدر مضرت رساں نہ ثابت ہو جسقدر کہ ہندوستان میں ہے اسلئے کہ یہاں مسلمانوں میں بھی ایک قسم کے خاندان مشترکہ کا رواج ہے یعنی پشتہا پشت تک لوگ ایک ساتھ رہ کر زندگیاں گزارتے ہیں اور بیٹوں کی جو کچھ کمائی ہوتی ہے

[1] بعض مولوی اس کوشش کی بھی مخالفت کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں اس سے حقداروں کا حق زائل ہوتا ہے۔

وہ جب تک باپ زندہ رہتا ہے، اسی کی ملکیت میں منضم ہوتی جاتی ہے۔

اب اگر اتفاق سے کوئی بیٹا باپ کی زندگی ہی میں اپنا بچہ چھوڑ کر مر جاتا ہے تو چونکہ اس کی کوئی جداگانہ ملکیت قائم نہیں ہوتی اسلئے اس کا کچھ ترکہ ہی نہیں قرار پاتا اور سارا مال و منال بچہ کے دادا کے قبضۂ تصرف میں رہتا ہے، پھر جب دادا مرتا ہے تو دوسرے حصہ دار بیچ میں آکر حائل ہو جاتے ہیں، جن کی وجہ سے وہ یتیم بچہ محجوب قرار پاجاتا ہے اور خود اس کے باپ کے گاڑھے خون کی کمائی دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔

اب ہم اس مسئلہ پر تفصیلی بحث شروع کرتے ہیں جس سے اس کی پوری حالت منکشف ہو جائے گی اور معلوم ہو جائے گا کہ آیا یتیم اولاد حقیقت میں محجوب ہے بھی یا نہیں۔ ہم جہاں تک غور کرتے ہیں قرآن اور حدیث تو خیر خود فقہ بھی اصولاً ان کو محجوب نہیں کرتی ہے۔

فقہاء نے حجب حرمان کو صرف دو اصول پر مبنی قرار دیا ہے۔

(۱) جو شخص مورث کے ساتھ کسی دوسرے شخص کے واسطہ سے رشتہ رکھتا ہے وہ اس وقت تک وراثت نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ درمیانی شخص موجود ہے۔

(۲) الاقرب فالاقرب۔ یعنی قریب کا رشتہ دار دور کے رشتہ دار کو محروم کرتا ہے۔ اصل الفاظ سراجی کے یہ ہیں:۔

وھو (حجب الحرمان) مبنی علی اصلین احدھما ان کل من یدلی الی المیت بشخص لا یرث مع وجود ذالک الشخص والثانی الاقرب فالاقرب۔

حجب حرمان دو اصول پر مبنی ہے، پہلا یہ کہ جو شخص میت سے کسی کے واسطے سے قرابت رکھتا ہے تو اس واسطہ کی موجودگی میں وارث نہیں ہوگا اور دوسرا الاقرب فالاقرب ہے۔

پہلا قاعدہ جس کو مختصر لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں ——— واسطہ کی موجودگی میں ذی واسطہ وارث نہیں ہوتا ——— یتیم پوتے کو کسی طرح محروم نہیں کرتا، اسلئے کہ پوتے کو دادا کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ بواسطہ اپنے باپ کے ہے۔ اور جب باپ جو واسطہ تھا موجود ہی نہیں ہے تو پھر پوتا کیوں محروم ہونے لگا۔

دوسرا قاعدہ الاقرب فالاقرب ہے اسی میں غلط فہمی واقع ہوئی ہے، اس کے ظاہری معنی خیال کر کے لوگوں نے یہ سمجھا کہ بیٹا جو قریبی رشتہ دار ہے، یتیم پوتے کو جو اس سے دور کا رشتہ دار ہے محجوب کر دے گا۔

در اصل یہی اور صرف یہی ایک قاعدہ ہے جس کی بنیاد پر یتیم اولاد محجوب قرار دی جاتی ہے۔ لہٰذا ہم اپنی بحث کا مرکز بھی اسی قاعدہ کو قرار دیتے ہیں ——— اگر یہ قاعدہ الاقرب فالاقرب اپنے ظاہری معنوں میں رکھا جائے یعنی یہ کہ مطلقاً درجہ کے لحاظ سے جو قریب ہو وہ بعید کو محروم کر دے تو وراثت کے بہت سے مسلمہ اور اجماعی مسائل ٹوٹ جائیں گے۔

مثال نمبر ۱

مسئلہ ۶	زید
بیٹا	دادا
۵	۱

اس مثال میں بیٹے کی موجودگی میں دادا کو حصہ ملا ہے، حالانکہ بیٹا میت سے بہ نسبت دادا کے اقرب ہے، کیونکہ بیٹا بلا واسطہ اس سے رشتہ رکھتا ہے اور دادا بواسطہ باپ کے اس کا رشتہ دار ہے۔

مثال نمبر ۲

زید — مسئلہ ۶

باپ	بیٹا	پڑنانی
۱	۴	۱

یہاں بیٹے اور باپ کے ہوتے ہوئے پڑنانی حصہ لے گئی جو نہایت دور کی رشتہ دار ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ[۱] کو اسی پر تعجب تھا کہ بھتیجا پھوپی کا وارث ہوتا ہے، اور پھوپھی بھتیجے کی وارث نہیں ہوتی، لیکن اگر موجودہ فقہ اُن کے سامنے ہوتی تو ان کو اور بھی حیرت ہوتی کہ نانی بلکہ پڑنانی تک تو نواسے کے ترکہ میں سے حصہ پاتی ہے اور نواسا ان میں سے کسی کا بھی ترکہ نہیں[۲] پاتا۔ دادا محجوب الارث پوتے کا وارث ہوتا ہے اور محجوب الارث پوتا دادا کا وارث نہیں ہوتا۔

مثال نمبر ۳

زینب — مسئلہ ۶

شوہر	ماں	دو اخیافی بھائی	دو حقیقی بھائی	دو علاتی بھائی
۳	۱	۲	محروم	محروم

اس مثال میں کسی قاعدہ کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

حجب حرمان کا پہلا قاعدہ یہ چاہتا تھا کہ دونوں مادری بھائی جو ماں کے واسطہ سے رشتہ رکھتے ہیں اس کی موجودگی میں محروم ہوں لیکن نہیں ہوئے۔

دوسرا قاعدہ بھی یہی چاہتا تھا کہ ماں جو قریبی رشتہ دار ہے، مادری بھائیوں کو محروم کر دے لیکن نہیں کر سکی۔

حقیقی اور علاتی بھائی جو قوت قرابت کے لحاظ سے اقوی اور اقرب تھے وہ بھی اخیافیوں کو نہیں محروم کر سکے بلکہ ان کی وجہ سے اُلٹے خود محروم ہو کر کہنے لگے۔

یہاں ہم بدنصیبوں کے جو حصہ میں نہیں آتی — الٹی رہ گئی کیا خوبیٔ قسمت وہیں بن کر

دنیا میں کون شخص ہے جو کہہ سکتا ہے کہ حقیقی بھائیوں کو محروم کر کے اخیافی بھائیوں کو حصہ دیدینا جو زیادہ تر اپنے کنبہ کے بھی نہیں ہوتے کسی معقول اصول وراثت پر مبنی[۳] ہے۔

---

[۱] چنانچہ کنز العمال میں ہے کہ وہ پھوپی اور خالہ کو محروم نہیں کرتے تھے۔

[۲] تعجب پر تعجب یہ ہے کہ ماں جو کمزور وارث ہے وہ تو دادی کو محروم کر دیتی ہے اور باپ جو قوی وارث ہے نانی کو نہیں محروم کر سکتا۔

[۳] اصل بنا اس کی یہ ہے کہ اس آیت میں "وان کان رجل یورث کلالۃ او امراءۃ ولہ اخ او اخت" ابی بن کعبؓ کی قراءت کے مطابق اخ او اخت کے بعد "لامّ" کا اضافہ کر کے فقہا نے اخیافیوں کو ذوی الفروض میں داخل کر دیا، اس لئے حقیقیوں سے جو عصبہ ہیں ان کا حق مقدم ہو گیا۔

لیکن اس آیت کے جو معنی قرار دیئے گئے ہیں وہ بوجوہ ذیل ٹھیک نہیں

(۱) ابی بن کعبؓ جن کی قراءت کے مطابق معوذتین قرآن سے خارج ہیں ان کے "لامّ" قراءت کی روایت جہاں تک ہم کو معلوم ہے بیہقی نے لکھی ہے جن کی تصنیفات کتب حدیث میں طبقۂ ادنیٰ کی ہیں۔

(باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

یہ سوچنے کی بات ہے کہ جس رشتہ سے اخیافی وارث بنائے گئے ہیں، حقیقیوں میں اگر باپ کے رشتہ کا نہ بھی خیال کیا جائے تو کم سے کم وہ رشتہ تو ضرور موجود رہے پھر ان کو محروم کرنے کے کیا معنی. چنانچہ امام مزنی کی کتاب المختصر میں ہے کہ اس صورت میں حضرت عمرؓ حقیقیوں کو محروم نہیں کرتے تھے۔

خود فقہا بعض جگہ دو قرابت والوں کو ایک قرابت والے سے اقویٰ قرار دیکر حصہ دلاتے ہیں، لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

مثال نمبر ۴

زید مسئلہ ۱۸

دو بیٹیاں	دو پوتیاں	پڑوتی	سکڑوتی	سکڑوتا
۱۲	۲	۱	۱	۲

اس صورت کو فقہا مسئلہ تشبیب کہتے ہیں. اس میں بیٹیاں اقرب ہیں۔ ان کی موجودگی میں نیچے والیوں کو محروم ہونا چاہئے تھا۔ لیکن بخلاف اس کے پوتی، پڑوتی، سکڑوتی، سکڑوتا جو سب نیچے اوپر مختلف درجہ کے ہیں آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بہن قرار دیئے گئے اور سب کو ترکہ میں سے حصہ مل گیا۔ لیکن ایک بدبخت یتیم پوتا ہی ہے جو اپنے باپ کی عدم موجودگی میں اس کے بجائے اپنے چچا کا بھائی نہیں قرار دیا جاسکتا۔

لبت شکرستاں واو حشیمت مے بہ میخواراں　　منم کز غایت حرماں نہ با آنم نہ با اینم

ان متعدد اور مختلف قسم کی مثالوں سے صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ قاعدہ الاقرب فالاقرب اپنے ظاہری معنی میں یعنی یہ کہ مطلقاً درجہ کے لحاظ سے جو قریب ہے وہ بعید کو محروم کردے نہیں لیا جاسکتا ورنہ تمام اعتراضات مذکورہ وارد ہوتے ہیں۔

ان اعتراضات سے بچنے کیلئے یہ جواب دیا گیا کہ یہ قاعدہ یعنی الاقرب فالاقرب صرف عصبات میں ہے ذوی الفروض میں جاری نہیں ہوتا۔

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) (۲) یہ قراۃ بمقابلہ قراۃ متواترہ کے بالاتفاق تمام امت کے نزدیک نامقبول ہوئی، اور کسی نے کلام نہیں پڑھا۔ لہذا اس سے استدلال کرنا اس کو ایک ساتھ ہی نامقبول اور مقبول دونوں قرار دینا ہے۔

۳۔ فقہا اور مفسرین "لہ" کی واحد مذکر غائب کی ضمیر کو رجل اور امراۃ دونوں کی طرف راجع کرتے ہیں جن میں سے امراۃ مونث حقیقی ہے وہ کبھی اس کا مرجع ہو ہی نہیں سکتی، اس صورت میں لھما، یا لکل واحد منہما چاہئے تھا۔

۴۔ توریث کلالہ والی آیت میں جو آخر سورہ میں ہے اخ اور اخت کے الفاظ بعینہٖ یہی ہیں۔ اب اگر دونوں آیتیں انھیں کی توریث کے متعلق قرار دیجائیں تو دونوں کو ناقص کہنا لازم آتا ہے یعنی اس آیت میں "لامّ" کا لفظ اور اس میں لاب وامّ یا لاب بڑھانا پڑے گا۔ حالانکہ اس کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔

۵۔ اگر اس آیت سے اخ اور اخت کی توریث مقصود تھی تو کیوں اللہ تعالیٰ نے لِاُمّ نہیں فرمایا۔ وہ خود کہتا ہے "وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا" تفسیر کے موقع پر ابہام کا ہے کے نقائص میں سے ہے جس سے قرآن بہت بالاتر ہے۔ آیت کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں: "اگر کوئی مرد کسی کلالہ کا وارث بنایا جائے یا کوئی عورت۔ بحالیکہ اس کلالہ کے کوئی بھائی یا بہن ہو تو اس مرد یا عورت میں سے ہر ایک کو ایک ایک سدس ملے گا۔

"لہ" کی ضمیر کا مرجع کلالہ ہے۔ اور "لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا" میں تثنیہ کی ضمیر رجل و امراۃ کی طرف راجع ہے نہ کہ اخ و اخت کی طرف۔ یورث باب افعال سے ہے مجرد سے نہیں ہے۔

اس آیت میں بھائی اور بہن کا حصہ قطعاً نہیں بیان کیا گیا بلکہ عہدی رشتہ داروں کا ہے. بھائی اور بہن کا ذکر صرف اس وجہ سے آگیا ہے کہ یہ والدین اور اولاد کی طرح عہدی رشتہ داروں کو محروم نہیں کرتے بلکہ ان کی موجودگی میں بھی وہ وارث ہوسکتے ہیں۔ (مزید تفصیل کیلئے ہماری کتاب الوراثۃ فی الاسلام (ملاحظہ فرمائیے)

لیکن پھر اس پر بھی اعتراضات پڑتے ہیں کہ اچھا بالفرض اگر یہ قاعدہ صرف عصبات میں ہے اور ذوی الفروض میں نہیں ہے تو جدات جو ذوی الفروض ہیں، ان میں قریب بعید کو کیوں محروم کرتی ہے، چنانچہ سراجی میں ہے۔

والقربیٰ من ای جھۃ کانت تحجب البعدیٰ من ای جھۃ کانت

جدہ قریبہ خواہ کسی طرف کی موجودہ بعیدہ کو خواہ کسی طرف کی ہو محجوب کردیگی۔

نیز بیٹیاں، پوتیوں کو اور حقیقی بہنیں جب ذوی الفروض ہوتی ہیں تو علاتی بہنوں کو کس قاعدہ سے محروم کرتی ہیں؟

ان اعتراضات سے مجبور ہو کر پھر فقہاء نے تسلیم کیا کہ الاقرب فالاقرب کا قاعدہ ذوی الفروض میں بھی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جن رشتہ داروں کی وراثت کا سبب متحد ہے، ان میں قریب بعید کو محجوب کرتا ہے یعنی ماں، نانی، پڑنانی، دادی، پڑدادی، ان سب کے وارث ہونے کا سبب "امومت" ہے جو سب میں یکساں پایا جاتا ہے، اس لئے ان میں سے جو قریب ہوگی وہ بعید کو محروم کردیگی۔
نیز بیٹیوں اور پوتیوں میں بھی سبب وراثت متحد ہے یعنی "بنتیت" اس وجہ سے بیٹیوں کی موجودگی میں پوتیاں محروم ہوجائیں گی۔
علیٰ ہذا حقیقی بہنیں بھی بوجہ اتحاد سبب وراثت اور قرب کے علاتی بہنوں کو محجوب کردیں گی۔

یہاں تک آکر فقہا اس بحث کو ختم کردیتے ہیں اور گویا یہ قاعدہ دوم یعنی الاقرب فالاقرب ان کے خیال میں اپنی جگہ پر مضبوط اور مستحکم ہوگیا لیکن ابھی اعتراضات اور باقی ہیں اور بلا ان کے جوابات دیئے ہوئے یہ عقدہ مشکل حل نہیں ہوسکتا۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ اتحاد سبب وراثت محض تمہاری خیالی توجیہ ہے، اس کو ہم تسلیم نہیں کرتے اور حقیقت یہ ہے کہ اسی قسم کی بے بنیاد توجیہات سے اس فن میں خرابیاں واقع ہوگئی ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اتحاد سبب وراثت کو جب ترکہ دلانے میں دخل نہیں ہے تو محروم کرنے میں کیسے داخل ہوگیا۔ مثال نمبر ۳ میں اخیافی بھائیوں میں جو سبب وراثت پانے کا ہے وہی حقیقیوں میں بھی موجود ہے، پھر بھی حقیقی محروم کئے گئے اور اخیافیوں کو ترکہ دیا گیا۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اتحاد سبب وراثت کو حجب حرمان میں اگر کوئی دخل ہے تو پھر ذوی الفروض ہی کے ساتھ اس کو کیا خصوصیت ہے۔ عصبات میں بھی یہی شرط لگانی چاہئے۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ بالفرض ہم نے آپ کے اس مشروط قاعدہ کو تسلیم بھی کرلیا کہ ذوی الفروض میں الاقرب فالاقرب کا قانون اس وقت جاری ہوگا جب ان میں سبب وراثت متحد ہوگا لیکن مندرجہ ذیل مثالوں میں یہ قاعدہ ٹوٹ جاتا ہے۔

مثال نمبر ۱

زید مسئلہ ۶

بیٹی	پوتی	بھتیجا
۳	۱	۲

یہاں بیٹی اور پوتی کا سبب وراثت متحد ہے اور یہ دونوں ذوی الفروض میں سے ہیں۔ پھر بھی بیٹی نے جو اقرب ہے پوتی کو محروم نہیں کیا۔

مثال نمبر ۲

زید مسئلہ ۶

حقیقی بہن	علاتی بہن	بھتیجا
۳	۱	۲

اس صورت میں بھی حقیقی اور علاتی بہنوں کی وراثت کا سبب متحد ہے اور دونوں ذوی الفروض ہیں، چاہیئے تھا کہ حقیقی علاتی کو بوجہ اقرب ہونے کے محجوب کرتی۔

علاوہ بریں عصبات میں جہاں آپ نے قاعدہ الاقرب فالاقرب کو بلا کسی قید کے رکھا ہے وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود اتحاد سبب وراثت کے بھی قریب بعید کو محجوب نہیں کرتا۔ مثلاً مسئلہ تشبیب کو لیجئے جو مثال نمبر ۴ میں دکھلایا گیا ہے اس میں پوتی، پڑپوتی، سکڑوتی سب کے وارث ہونے کا سبب متحد ہے بلکہ چونکہ وہ سب کی سب سکڑنے کی وجہ سے عصبہ بنائی گئی ہیں اس وجہ سے ان کے عصبہ ہونے کا بھی سبب ایک ہی ہے، پھر بھی ان میں قریب نے بعید کو محجوب نہیں کیا اور سب کو ایک ہی درجہ میں رکھکر یکساں حصہ دیا گیا۔

اسی طرح جب عصبہ اور ذوی الفروض کا باہم اجتماع ہوتا ہے تو کہیں فقہ اس قاعدہ کو جاری کرتی ہے اور کہیں نہیں کرتی، بیٹا عصبہ کے ساتھ پوتی صاحبۂ فرض محروم ہو جاتی ہے، لیکن باپ عصبہ کے ساتھ نانی صاحبۂ فرض محروم نہیں ہوتی۔

الغرض یہ صاف روشن ہو گیا کہ الاقرب فالاقرب کا قاعدہ جس معنی میں فقہا نے استعمال کیا ہے کسی تاویل سے ٹھیک نہیں ہوتا بلکہ ہر پہلو سے خود انہیں کے مسلمات سے ٹوٹ جاتا ہے، لہذا ایسے غیر مسلم قاعدے سے یتیم اولاد کو محجوب کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ الاقرب فالاقرب کے قاعدے میں اقرب کا ظاہری مفہوم اگر مراد لیا جائے یعنی یہ کہ مطلقاً درجے کے لحاظ سے جو قریب ہو وہ بعید کو محجوب کر دے تو یہ قاعدہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، یہاں اقرب سے بجز اس کے کچھ مراد نہیں لیا جا سکتا کہ:

اقرب وہ رشتہ دار ہے جو بلاواسطہ مورث سے رشتہ رکھتا ہو یا بالواسطہ لیکن بروقت وفات مورث کے وہ واسطہ موجود نہ ہو۔

جس طرح کہ میت کے مرنے کے وقت اگر اس کا باپ موجود نہیں ہے تو دادا بجائے باپ کے رکھا جاتا ہے، اس لئے کہ بیچ میں جو واسطہ تھا یعنی باپ جس کی وجہ سے دادا محجوب ہو جاتا تھا وہ نہیں ہے، لہذا دادا اس واسطہ کی عدم موجودگی سے خود اقرب ہو گیا اور اب کوئی اقرب خواہ وہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو دادا کو محجوب نہیں کر سکتا۔

اسی طرح مورث کی وفات کے وقت اگر اس کا کوئی یتیم پوتا ہے تو وہ اپنے متوفی باپ کی جگہ رکھا جائے گا اور وہی حصہ لے گا جو اس کے باپ کا تھا، مورث کا جو بیٹا موجود ہے وہ اس کو محجوب نہیں کر سکتا۔ اسلئے کہ واسطہ کی عدم موجودگی سے وہ خود اقرب ہو گیا ہے۔ تعجب ہے کہ دادا کے معاملہ میں تو فقہا اقرب کا یہی مفہوم لیتے ہیں لیکن پوتے کے معاملے میں نہیں۔ پوتے کی بدنصیبی کے سوا اور اس کی کوئی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

من ازیں طالع شورہ بر نجم دریغ بہرہ مند از سر کویت دگرے نیست کہ نیست

حقیقت یہ ہے کہ وراثت کا سارا دارومدار قائم مقامی پر ہے۔ لہذا جس بچہ کا باپ مر گیا ہے وہ وراثت میں اس کا قائم مقام سمجھا جائے گا۔ فقہا نے اس مسئلہ میں اسی اصل نکتہ یعنی قائم مقامی کا لحاظ نہیں رکھا جس کی وجہ سے ایسی عظیم الشان غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ یتیم بچوں کو محجوب کرنے لگے۔ یہ امر غور کے قابل ہے کہ جس بیٹے کی موجودگی کی وجہ سے یتیم پوتے کو فقہا محجوب قرار دیتے ہیں وہ بیٹا صرف ایک ہی طرف سے کیوں حاجب ہوتا ہے یعنی صرف پوتے ہی کو دادا کے ترکہ سے کیوں محجوب کرتا ہے، دادا کو اس پوتے کے ترکہ سے کیوں نہیں محجوب کرتا

بلکہ دادا کی وجہ سے الٹا خود ہی محروم ہو جاتا ہے اس سے صاف نمایاں ہو جاتا ہے کہ قائم مقامی کے اصول پر وہ کسی طرح پوتے کا حاجب نہیں ہو سکتا۔

حاصل یہ کہ اقرب کا سوائے اس کے جو ہم نے اوپر لکھا ہے اور کوئی مفہوم ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی معنی لینے سے الاقرب فالاقرب کا قاعدہ جو تقسیم وراثت میں اصل الاصول اور بنیادی قانون ہے اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھ جاتا ہے۔

محجوب پوتے کو وارث بنانے پر ظاہر میں جو شبہات ہو سکتے ہیں ہم ان کو خود ہی لکھ کر ان کے جوابات بھی دیتے ہیں تاکہ اس مسئلہ کی اچھی طرح توضیح ہو جائے۔

شبہ اول: محجوب پوتے کو قرآن کریم کی رو سے کیسے ترکہ دیا جا سکتا ہے اس میں تو کہیں پوتے کا ذکر نہیں، صرف اولاد کا لفظ ہے جس کے معنی بیٹا بیٹی کے ہیں۔

جواب: اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ غیر محجوب پوتوں کو فقہا بھی تو ترکہ دلاتے ہیں پس جو آیت ان کی وراثت کی دلیل قرار دی جائیگی وہی ہماری بھی دلیل ہوگی۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ اولاد کا لفظ جو قرآن میں ہے اس کے معنی صرف بیٹا بیٹی کے نہیں ہیں بلکہ نیچے تک تمام اولاد اس میں داخل ہے تفسیر خازن میں آیت "ولهن الربع مما ترکتم" کے ذیل میں لکھا ہے:۔

اسم الولد یطلق علی الذکر والانثی ولا فرق بین الولد وولد الابن وولد البنت فی ذلک

ولد کا لفظ مذکر و مؤنث دونوں کیلئے بولا جاتا ہے اور اس میں اولاد، اور بیٹے کی اولاد اور بیٹی کی اولاد میں کوئی فرق نہیں۔

فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد ۱۲ صفحہ ۸ مطبوعہ مصر میں ہے:۔

الولد اعم من الذکر والانثی ویطلق علی الولد الصلب وعلی ولد الولد وان سفل۔

ولد کا لفظ مذکر اور مونث دونوں سے عام ہے اور صلبی اولاد اور نیچے تک اولاد کی اولاد پر بولا جاتا ہے۔

فقہا بھی اس کے ساتھ متفق ہیں، وہ ولد میں ولد الابن کو داخل سمجھتے ہیں۔ شریفیہ شرح سراجی صفحہ ۲۶ مطبوعہ مطبع یوسفی لکھنؤ میں ہے۔

ولد الابن داخل فی الولد لقولہ تعالٰی یا بنی آدم

اولاد میں بیٹے کی اولاد بھی داخل ہے کیونکہ ہم کو اللہ تعالٰی نے بنی آدم کہا ہے۔

آیت توریث میں جہاں جہاں بھی ولد کا لفظ آیا ہے ہر جگہ بالاتفاق فقہا نے نیچے تک تمام اولاد نرو مادہ کو اس میں داخل سمجھا ہے۔ مثلاً

فان کان لهن ولد فلکم الربع مما ترکن

اگر ان کی (تمہاری بیویوں کی) کوئی اولاد ہو تو ان کے ترکہ میں سے تم کو چوتھائی ملیگا۔

فقہا میں سے ایک نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ بیویاں جب صلبی بیٹا یا بیٹی چھوڑ کر مریں اسی وقت شوہروں کو چوتھائی ملے گا بلکہ سب کا اتفاق ہے کہ وہ پوتا، پوتی، پڑپوتا، پڑپوتی کسی کو بھی اگر چھوڑیں تو شوہر کو چوتھائی ملے گا۔

اولاد تو پھر بھی ایک عام لفظ ہے، ابن و بنت کے الفاظ جو عربی زبان میں خاص بیٹا بیٹی کے لئے وضع کئے گئے ہیں، وہ بھی قرآن میں کئی جگہ وسیع معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں، اور نیچے تک کی تمام اولاد کو شامل ہیں، جا بجا اللہ تعالیٰ نے ہم کو "یا بنی آدم" کہہ کر خطاب کیا ہے بیسیوں نسلیں حضرت یعقوب کی گزر گئی تھیں لیکن ان کی اولاد قرآن میں یا بنی اسرائیل کہہ کر پکاری گئی۔

دور کیوں جائیے خود آیت وراثت ہی کے ایک رکوع کے بعد ہے، حرمت علیکم امہاتکم وبناتکم، یہاں بنات کے لفظ کو تمام فقہا نے بیٹیوں، پوتیوں، پڑپوتیوں، یہانتک کہ نواسیوں پر بھی شامل تسلیم کیا ہے، اس لئے آیت وراثت میں جو اولاد کا لفظ ہے اس میں یقیناً پوتا داخل ہے اور کسی طرح خارج نہیں ہو سکتا۔

اور یہ مجازاً نہیں ہے بلکہ حقیقتاً ہے، جیسا کہ علامہ ابوبکر بن العربی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے۔ کیونکہ ولد کا لفظ ولادت سے مشتق ہے، اسلئے اولاد کی اولاد بھی حقیقتاً اولاد ہے جس طرح کہ جز کا جز بھی یقیناً جز ہے۔

شبہ دوم: جب محجوب پوتے کو وراثت دلائی جاتی ہے تو پھر سب پوتے برابر ہیں، ہر ایک کا رشتہ دادا کے ساتھ یکساں ہے۔ لہذا صرف وہی پوتا کیوں دادا کا ترکہ پائے جس کا باپ دادا سے پہلے مرگیا ہے، وہ پوتے بھی کیوں نہ وارث ہوں جن کے باپ موجود ہیں۔

جواب: جن پوتوں کے باپ موجود ہیں، اصل میں محجوب وہی پوتے ہیں، کیونکہ ان کے باپ خود ان کے اور ان کے دادا کے درمیان حاجب ہیں، نہ وہ دادا کا ترکہ پوتے کو پہنچنے دیتے ہیں اور نہ پوتے کا ترکہ دادا کو بلکہ دونوں طرف سے بیچ میں خود ہی وارث بن جاتے ہیں اسلئے وہ پوتے جن کے باپ موجود ہیں دادا کے مرنے پر اقرب نہیں ہو سکتے، بخلاف اس پوتے کے جس کا باپ مرگیا ہے کیونکہ واسطہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ دادا کا اقرب ہو جائے گا اسلئے وارث ہو گا۔

بعینہ اس کی مثال ایسی ہے جس طرح کوئی شخص نانی، دادی، اور باپ کو چھوڑ کر مر جائے، ظاہر ہے کہ دادی کو میت کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ کسی طرح نانی کے رشتہ سے کم نہیں ہے، لیکن بوجہ اس کے کہ باپ درمیان میں حاجب موجود ہے دادی محجوب ہو جاتی ہے اور نانی حصہ پا جاتی ہے کیونکہ نانی اور مورث کے درمیان کوئی حاجب موجود نہیں ہے۔

شبہ سوم[ۃ]: بیٹا اور پوتا دونوں عصبہ ہیں اور عصبات میں یہ قاعدہ ہے کہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ "اولی رجل ذکر" یعنی قریب ترین مرد کو دیا جاتا ہے اسلئے بیٹے کے ہوتے ہوئے اس قانون کی رو سے یتیم پوتے کو کچھ نہیں ملے گا۔

جواب: اگر عصبات میں "اولی رجل ذکر" کو آپ بطور قانون کلی کے قرار دیتے ہیں تو خود کیوں اس کو جا بجا توڑتے ہیں، مثلاً

مسـ		
دو بیٹیاں	بہن	بھتیجا
۲	۱	محروم

اس مثال میں بیٹیاں ذوی الفروض ہیں، ان کو دو ثلث دینے کے بعد جو کچھ بچا تھا وہ اس قاعدہ کی رو سے بھتیجے کو جو اقرب ترین مرد ہے ملنا چاہیئے تھا، لیکن وہ تو محروم کر دیا گیا، اور بہن جو زن مادہ ہے بقیہ کی وارث ہو گئی۔

ۃ یہ شبہ علمائے اہل حدیث کی طرف سے کیا گیا ہے۔

علیٰ ہٰذا مسئلہ تشبیب یعنی مثال نمبر ۲ کو دیکھئے اس میں مرد نر اور زن مادہ سب کو ایک ساتھ وارث بنایا گیا ہے کیا قانون کلی ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جو قدم قدم پر ٹوٹ جایا کریں؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث: الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھی لاولیٰ رجل ذکر" ذوی الفروض کو ان کے حصے دیکر بقیہ قریب ترین مرد کو دیدو" کسی خاص مسئلہ کے متعلق فرمائی گئی ہے۔ مثلاً یہ صورت فرض کیجئے کہ کوئی شخص ماں، بیٹی، باپ، چچا اور بھائی کو چھوڑ کر مرگیا اس کے بارہ میں یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ ذوی الفروض کے حقوق دیکر جو کچھ بچے قریب ترین مرد کو دیدو لیکن اس کو ایک عام اصول قرار دے لینا صریحاً قرآن کے منافی ہے۔

مثال نمبر ۱

زید مسئلہ ۶ — ۱۸

ماں	بیٹی	بیٹا
۳	۵	۱۰

یہاں ماں کو ایک سدس دینے کے بعد آپ کے اس قانون کلی کے مطابق بقیہ پانچ سدس بیٹے کو ملنا چاہئے لیکن قرآن مجید اس کے برخلاف اس صورت میں بیٹا اور بیٹی دونوں کو وارث بناتا ہے اور بیٹے کا نصف بیٹی کو دلاتا ہے۔

زید مسئلہ ۶ — ۱۸

ماں	بیٹی	بہن	بھائی
۳	۹	۲	۴

اس صورت میں ماں اور بیٹی جو ذوی الفروض میں ان کا حصہ دینے کے بعد بقیہ بھائی کو ملنا چاہئے تھا کیونکہ وہ" اولیٰ رجل ذکر" ہے، لیکن قرآن کریم بھائی اور بہن دونوں میں للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق ترکہ تقسیم کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اب سوچئے کہ یہ حدیث جس کی صحت پر تمام اہلِ سنت متفق ہیں قانونِ کلی قرار دینے سے ان کے خلاف پڑتی ہے اور غلط ہوئی جاتی ہے اس لئے یقیناً یہ کسی خاص مسئلہ ہی کے متعلق ہوسکتی ہے۔

یہاں ایک امر اور غور کے قابل ہے کہ آپ جہاں اس کو قانونِ کلی قرار دیتے ہیں کہ بقیہ" اولیٰ رجل ذکر" کو ملنا چاہئے۔ وہاں اس حدیث کو بھی قانونِ کلی ہی سمجھتے ہیں کہ" اجعلوا الاخوات مع البنات عصبۃ" بہنوں کو بیٹیوں کے ساتھ عصبہ بنادو۔

اس مثال نمبر ۲ میں بتائیے تو سہی کہ آپ نے اپنے ان دونوں کلی قوانین میں سے کس پر عمل کیا ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ بیٹیوں کے ساتھ بہنوں کو بھی حصہ مل سکتا ہے۔ یہانتک کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ اولاد کے ساتھ بہنوں کو وارث بناتے ہیں وہ آئیں ہم ان کے ساتھ مباہلہ کیلئے تیار ہیں کہ جھوٹے پر اللہ کی لعنت ہو۔

شبہ چہارم: صحیح بخاری کتاب الفرائض میں ہے۔ ولا یرث ولد الابن مع الابن۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وراثت نہیں پاتا۔

جواب: اس جملہ کے معنی تو یہ ہوئے کہ" بیٹے کی اولاد خود اس بیٹے کی موجودگی میں وراثت نہیں پاتی"۔ اسلئے کہ اس جملہ میں

دونوں جگہ لفظ ابن پر الف لام تعریف کا ہے اور اصول فقہ میں یہ قاعدہ مقرر ہے کہ ایسی صورت میں دونوں سے مراد ایک ہی ذات ہوتی ہے، چنانچہ نورالانوار میں ہے:۔

المعرفۃ اذا اعیدت کانت الاولیٰ عین الثانیہ

معرفہ جب دوبارہ لایا جائے گا تو پہلا بعینہ دوسرا ہوگا۔

چنانچہ اسی بنیاد پر اس میں لکھا ہے کہ اس آیت میں

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا

یقیناً دشواری کے ساتھ آسانی ہے یقیناً دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔

عُسر ایک اور یُسر دو سمجھے گئے ہیں سند میں شاعر کا یہ شعر پیش کیا ہے:۔

اذا اشتدت بک البلویٰ ففکر فی الم نشرح فعسر بین یسرین اذا فکرتہ فافرح

جب تجھ پر بلاؤں کی شدت ہو تو الم نشرح کی سورت میں غور کر کیونکہ ایک دشواری دو آسانیوں کے درمیان ہے یہ سوچکر خوش ہو جا۔

اصول فقہ کی رو سے اس کے معنی یہی ہوئے کہ بیٹے کی موجودگی میں خود اس کی اولاد محروم رہتی ہے یہ نہیں کہ کسی بیٹے کی موجودگی میں وہ حصہ نہ پائے، اس لئے یہ ہمارے مدعا کے مخالف نہیں ہے بلکہ مطابق ہے۔

علاوہ بریں یہ حدیث نبوی نہیں ہے، صرف حضرت زید بن ثابت کا قول ہے اور تفسیر اور حدیث کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم وراثت کے مسائل میں اکثر رائے رکھتے تھے اور ان میں باہم ایک دوسرے سے اختلاف ہو جاتا تھا، چنانچہ کئی مسئلوں میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت زید بن ثابت میں اختلاف واقع ہوا ہے اور ایک نے دوسرے کی رائے کو تسلیم نہیں کیا۔ فتح الباری میں جد کے متعلق ایک قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسی کی وراثت کے بارے میں اپنے زمانے میں سو فیصلے کئے اور سب ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

شبہ پنجم: امام بخاریؒ نے یہی باب باندھا ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں بیٹے کی اولاد وراثت نہیں پاتی۔

جواب: بیشک، لیکن جو دلیل وہ اس کے اوپر لائے ہیں وہ ایک تو یہی حضرت زید بن ثابتؓ کا قول ہے جس کے متعلق تفصیل کے ساتھ ہم لکھ چکے ہیں، دوسری "اولیٰ رجل ذکر" والی حدیث ہے جس کے بارہ میں ہم نے ثابت کیا ہے کہ وہ صرف کسی جزئی مسئلہ کا حکم ہے، قانون کلی نہیں ہوسکتی۔

شبہ ششم: جب بڑے بڑے علماء و فقہائے امت نے جن کی بزرگی اور علمی عظمت کو تم خود تسلیم کرتے ہو، اپنی کتابوں میں تصریح کے ساتھ لکھدیا ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں یتیم اولاد محجوب ہوتی ہے تو پھر تم اس مسئلہ کو کیوں تسلیم نہیں کرتے۔[1]

جواب: ان تصریحات سے میں بھی واقف ہوں لیکن فقہی مسائل میں ہم کو ہر ایک فقیہ سے خواہ وہ کتنا ہی معظم و محترم کیوں نہ ہو

---

[1] یہ بات میرے جواب میں مدرسہ دیوبند کے مفتی صاحب نے لکھی ہے۔

اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے، اور خاص کر اس مسئلہ میں جس کی عدم صحت کے قوی دلائل ہمارے پاس موجود ہوں، ایسے تنازع کی صورت میں قرآن مجید یہ حکم دیتا ہے۔

فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر

تم کسی بات میں آپس میں جھگڑ پڑو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو اگر اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔

اس لئے تاوقتیکہ کتاب اللہ کی کسی آیت سے اس مسئلہ کا ثبوت نہ دیا جائے، یا کوئی حدیث صحیح یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا کوئی فیصلہ پیش نہ کیا جائے اس وقت تک ہم کیونکہ ایسا مسئلہ تسلیم کرلیں جو اسلامی شفقت بلکہ انسانی فطرت کے بھی خلاف معلوم ہوتا ہے، اور جس کے مان لینے سے دشمنانِ اسلام کو اسلام کے قانون پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے۔

علمائے امت نبی تو نہیں ہیں کہ معصوم ہوں چنانچہ خود ان میں باہم بیشمار اختلافات ہیں قطعی حجت صرف کلام اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہی ہے اور بس۔

قرآن اور حدیث دونوں متوفی بیٹے کی اولاد کو قطعاً محروم نہیں کرتے، فقہ میں اقرب کا صحیح مفہوم متعین نہیں کیا گیا، جس کی وجہ یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ یتیم اولاد محجوب قرار پاگئی، حالانکہ خود فقہا کے یہاں اس کے خلاف مثالیں موجود ہیں، مثلاً بیٹی کے ساتھ پوتی کو بھی وہ حصہ دلاتے ہیں، نیز پوتی، پڑپوتی، سکڑپوتی سب کو ایک درجہ میں رکھ کر برابر ترکہ دیتے ہیں لیکن یتیم اولاد کے بارے میں آکر یک قلم حجب حرمان کا فرمان صادر کردیتے ہیں۔

باکہ ایں نکتہ تواں گفت کہ آں شیریں لب کشت ما را و دم عیسیٰ مریم با اوست

یتیم اولاد کو خاندانی حقوق سے خارج کردینا اور ان کو ہمیشہ کیلئے ان کے آباؤ اجداد کی جائداد اور ملکیت سے محروم کردینا ایک ایسا خلاف فطرت قانون ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ کیونکہ انصاف پسند عقلا اس کو جائز رکھتے ہیں، کوئی شخص ٹھنڈے دل سے سوچکر انصاف سے کہے کہ خدانخواستہ اگر وہ خود یا اس کی اولاد اس قانون کی رو سے محجوب ہو تو کیا وہ اس کو پسند کرے گا؟ لہذا ہرچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند، قرآن میں ہے:۔

ولیخش الذین لو ترکوا من خلفھم ذریۃ ضعافا خافوا علیھم۔ فلیتقوا اللہ ولیقولوا قولا سدیدا

اور ان لوگوں کو خوف کرنا چاہیے جو اگر اپنے بعد ناتوان اولاد چھوڑ جاتے تو ان پر ترس کھاتے اسلئے ان کو چاہیئے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور ٹھیک بات کہیں۔

پوتوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت قرار دیا ہے، چنانچہ فرمایا ہے۔

واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجا وجعل لکم من ازواجکم بنین وحفدۃ ورزقکم من الطیبات افبالباطل یومنون وبنعمۃ اللہ ھم یکفرون۔

اور اللہ نے تمہیں میں سے تمہاری بیویوں کو پیدا کیا اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور پاک چیزوں سے تم کو روزی عطا فرمائی۔ کیا پھر بھی لوگ جھوٹے معبودوں پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔

کیا نعمت الٰہی کی قدر و حرمت یہی ہے کہ وہ خاندان سے خارج اور اپنے باپ دادا کی کمائی اور محنت کے ثمرہ سے محروم کر دی جائے اور در بدر ٹھوکریں کھاتی پھرے۔

یتیم اولاد کے محجوب کرنے میں صرف یہی برائی نہیں ہے کہ وہ اسلامی شفقت اور انسانی فطرت کے خلاف ہے بلکہ معاشرت میں اس سے خرابیاں واقع ہو سکتی ہیں۔

ایک خرابی تو یہ ہے کہ محجوب اولاد کے دلوں میں محرومی کی وجہ سے رنجش پڑ جاتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص فرشتہ تو نہیں ہے کہ مادی جذبات سے بالاتر ہو، انسان کی فطرت اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ جب وہ دیکھتا ہے کہ میرے ہی بزرگوں کی کمائی سے جن کا خون میری رگوں میں گردش کر رہا ہے، میرے چچا زاد بھائی تو عیش و عشرت کر رہے ہیں اور میں بلا کسی قصور کے اس سے بالکل محروم ہوں تو اس کو صبر نہیں آتا۔

سخن درست بگویم نمے توانم دید که مے خورند حریفان و من نظارہ کنم

اس رنجش کی بدولت خاندان میں ایک دائمی عداوت کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے دینی اور دنیاوی برکتیں مفقود ہو جاتی ہیں اور ترقی نہیں ہوتی بلکہ بعض حالتوں میں یہ عداوت خاندان پر تباہی اور بربادی لاتی ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ اب لائق بیٹوں کو جو باپ کے خدمت گزار ہیں اور اس کی ملکیت کے انتظام و ترقی میں دن رات محنت اور کوشش کرتے ہیں، یہ یقین ہو جائے گا کہ اگر اتفاقاً وہ اپنے باپ سے پہلے مر گئے تو ان کی اولاد محجوب ہو جائے گی۔ تو وہ باپ کی خدمت اور اس کے کاروبار سے پہلو تہی کرنے لگیں گے اور اپنی کمائی اور کوشش سے اپنی جداگانہ ملکیت پیدا کرنے کی فکر میں پڑ جائیں گے کہ اگر احیاناً ایسا حادثہ پیش آ جائے تو ان کی اولاد کے پاس کچھ سرمایہ رہے اور وہ بالکل ہی دست نگر اور محتاج نہ رہ جائے، اسلئے کہ یہ امر فطرتی ہے کہ انسان کو اپنے ماں باپ سے زیادہ اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے۔

تو ایسی حالت میں جبکہ بیٹے اس خیال میں پڑ جائیں گے نہ باپ کی جائیداد و ملکیت کا انتظام درست ہو گا نہ اس میں ترقی ہو سکے گی۔ علاوہ بریں باپ کو اپنے بڑھاپے کے زمانے میں بھی جو توبہ اور عبادت کا وقت ہے اپنے دنیاوی کاروبار سے سبکدوشی حاصل نہ ہو سکے گی، اور اولاد سے وہ جائز آسائش اس کو نہ مل سکے گی جس کی عہد پیری میں ان سے توقع کی جاتی ہے اور نہ اولاد ہی اس کی خدمت کر کے سعادتمندی حاصل کرنے کے قابل ہو گی۔

تیسری خرابی ایک مثال سے سمجھ میں آ سکتی ہے، فرض کیجئے کہ ایک دولتمند کے دو بیٹے ہیں جن میں سے ایک بیٹے کے چار بیٹے، ایک کا صرف ایک ہی بیٹا ہے، اب اگر چار بیٹوں کا باپ خود اپنے باپ کی زندگی ہی میں مر جائے تو اس کے چاروں بیٹے محجوب الارث کے قانون کی رو سے سمجھ لیں گے کہ جو کچھ خاندانی ملکیت ہے وہ دادا کے مرنے پر چچا کو اور پھر اس سے منتقل ہو کر چچا زاد بھائی کو ملے گی، ہم چاروں بھائی تو ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہو گئے، اس لئے ان میں سے اگر کوئی محرومی کے خیال سے غیظ و غضب میں آ کر اپنے بھائیوں کی خاطر بلا ان کے مشورہ کے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر دادا کی زندگی ہی میں، چچا کو

کسی حیلہ سے مار ڈالے تو بالکل قرینِ قیاس ہے۔ کیونکہ آئے دن مال و دولت کے پیچھے دنیا میں خونریزیاں ہوتی رہتی ہیں، بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ بشرطِ ثبوت قاتل کو سزا مل جائے گی لیکن اس کے بقیہ تین بھائی جو پہلے بالکل محروم تھے، اب دادا کے ترکہ میں سے تین ثلث کے حصہ دار ہوں گے اور اپنے چچازاد بھائی سے جو پہلے اپنے باپ کے ذریعہ سے سارے ترکہ کا وارث ہوتا تگنا حصہ پائیں گے اس غریب کا باپ بھی مارا گیا اور حصہ بھی صرف ایک چوتھائی رہ گیا۔ اور قاتل کے بھائی جو محجوب تھے اس سے تگنے کا حقدار ہو گئے۔

اس لئے یہ محجوب الارث کا مسئلہ بعض صورتوں میں قتل اور قطع رحم کا بھی محرک ہو سکتا ہے۔

الغرض مسئلہ محجوب الارث میں ظاہری اور باطنی ہر قسم کی خرابی ہے اور یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ اسی وجہ سے اہل اسلام اس مسئلہ کو اگرچہ مانتے چلے آتے ہیں لیکن ان کی طبیعتیں اس سے مالوف نہیں ہیں اور عام طور پر ان کے دلوں میں یہ کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔

امید ہے کہ فقہائے اسلام ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر اس مسئلہ پر غور فرمائیں گے اور نہایت کمزور دلائل کی بنیاد پر یتیم اولاد کو خاندانی حقوق سے بلاقصور محروم کر کے اسلام کے مقدس دامن پر یتیموں کے خون کے دھبے نہ ڈالیں گے۔

ہم سے غلطی ہونی ممکن ہے لیکن اسلام دینِ الٰہی ہے وہ ہر قسم کی غلطیوں سے مبرا اور پاک ہے۔

گر من آلودہ دامنم چہ عجب		ہمہ عالم گواہِ عصمتِ اوست

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

لہ فقہا ایک درجہ کے ایک قسم کے ورثہ میں ترکہ کو علی الروس تقسیم کرتے ہیں، مثلاً زید اگر اپنے چار پوتے چھوڑ کر مر جائے جن میں سے تین ایک بیٹے کے ہوں اور ایک ایک بیٹے کا تو وہ چاروں برابر کے حصہ دار ہوں گے۔ یہ طرز تقسیم ایسا ہے کہ نہ اس پر قرآن شاہد ہے نہ حدیث، اور عقل کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ وہ تینوں بیٹے اپنے باپ کے قائم مقام ہیں جو زیادہ سے زیادہ نصف کا حصہ دار ہو سکتا تھا۔ پھر اس کے قائم مقام تین ثلث کیونکر پا سکتے ہیں۔ یہاں بھی فقہا نے قائم مقامی کے اصول کو نظرانداز کر دیا۔

غلام اور لونڈیاں

آپ کسی مسجد کے منبر سے صداقت وحقانیتِ اسلام پر وعظ سنئے یہ بلند آہنگ دعاوی ہمیشہ آپ کو سنائی دینگے کہ

اسلام نے مذہبی آزادی عطا کی۔

اسلام نے دنیا سے غلامی کا نام ونشان مٹایا۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے واعظین ومصلحین کے یہ دعوے بہت بڑی صداقت کے حامل ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ اتنے ہی بڑے جھوٹ پر مبنی ہیں۔ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ ہم نے اتنی بڑی متضاد باتیں کس طرح لکھ دیں؟ لیکن یہ تضاد فی الواقعہ موجود ہے اور ہر سوچنے والے دماغ کے لئے عبرت وموعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ لاریب فیہ کہ اسلام نے نوعِ انسانی کو مذہبی آزادی عطا کی اور اس نے دنیا سے غلامی کے نام ونشان کو مٹایا۔ اسلئے اسلام جتنی بڑی بلند آہنگی سے چاہے متذکرہ صدر دعاوی کو دنیا کے سامنے پیش کرے اسے اس کا حق حاصل ہے اور اس باب میں نوعِ انسانی پر اس کا احسانِ عظیم ہے۔ لیکن کونسا اسلام؟ وہ اسلام جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ جسے ذاتِ رسالتمآبؐ نے دنیا کو دیا اور جو آج بھی قرآن کی دفتین میں محفوظ ومصئون موجود ہے۔ یہ ہے ان دعاوی کی عظیم القدر صداقت کی سند۔ لیکن جس اسلام کو ہمارے اربابِ شریعت پیش کرتے ہیں اگر اس کی طرف سے یہ دعاوی پیش کئے جاتے ہیں تو یہ فی الواقعہ بہت بڑے جھوٹ پر مبنی ہیں اس لئے کہ اسلام نے نہ مذہبی آزادی عطا کی ہے نہ غلامی کو مٹایا ہے۔ اس اسلام نے مذہبی آزادی کا گلا کس طرح گھونٹا، اس کی تصویر آپ "قتلِ مرتد" کے مضمون میں دیکھ چکے ہیں (جو طلوعِ اسلام بابت مارچ ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکا ہے)۔ زیرِ نظر مقالہ میں یہ دیکھئے کہ غلامی کے بارے میں اُس اسلام کا کیا ارشاد ہے جسے عجمی سازشوں نے وضع کیا اور جسے مُلّا، خدا اور اس کے رسول کی طرف منسوب کرکے، وجہِ ننگِ اسلام اور باعثِ تذلیلِ انسانیت بن رہا ہے۔

قرآنی اسلام کی تعلیم

پہلے یہ دیکھئے کہ قرآنی اسلام کی اس باب میں کیا تعلیم ہے۔ بعثتِ نبی اکرمؐ کے وقت، ملوکیت۔ پیشوائیت سرمایہ داری۔ نسل پرستی اور قومیت کی طرح غلامی بھی دنیا میں ایک مسلّمہ کی حیثیت سے رائج تھی، مستبد بادشاہوں کو چھوڑیئے۔ مفکرینِ عالم کی یہ کیفیت تھی کہ ارسطو کے پاس نشتر غلام تھے اور وہ غلامی کے جواز (بلکہ وجوب) میں نشتر دلیلیں پیش کیا کرتا تھا۔ عرب میں غلام اور لونڈیاں ان کے معاشرے کا لاینفک جزو بن چکے تھے۔ باہر غلام کام کاج کرتے تھے اور گھروں میں لونڈیاں جنسی تمتع کے مصرف میں لائی جاتی تھیں۔ ان کے ہاں صدیوں سے یہی روش چلی آرہی تھی اسلئے، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، غلام اور لونڈیاں ان کے معاشرے کا جزو بن چکے تھے اور ان کی معاشی زندگی کا بیشتر مدار انہی پر تھا۔

قرآن ان اغلال وسلاسل کو توڑنے کیلئے آیا تھا جن میں نوعِ انسانی جکڑے چلی آ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ غلامی جیسی بدترین لعنت کی زنجیروں کو کس طرح روا رکھ سکتا تھا۔ قرآن کا پیغام، شرفِ انسانیت کا پیغام، اور اس کی دعوت، احترامِ آدمیت کی دعوت ہے۔ اس کے خدا کا اعلان ہے کہ ولقد کرمنا بنی آدم "ہم نے فرزندِ آدم کو مستحقِ تکریم بنایا ہے"۔ یعنی انسان بہ حیثیت انسان، واجب التکریم ہے۔ اس کا انسان ہونا اس کے لئے باعثِ شرف ہے اور یہ شرف و تکریم ہر فرزندِ آدم کیلئے ہے۔ تمام نوعِ انسانی کو "نفس واحدہ" سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور ہر انسان کے اندر "روحِ خداوندی" پھونکی گئی ہے۔ یعنی ہر انسان، صفاتِ خداوندی کی ممکنات کا حامل ہے۔ اور قرآنی معاشرے کا مقصود و مطلوب فقط یہ ہے کہ ان ممکن صفات کو مشہود بنا کر ان کی کامل نشوونما کر دے۔ انسان کے متعلق جس دین کی یہ بنیادی تعلیم ہو، ظاہر ہے کہ اس میں انسانی غلامی کا تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کے سامنے دو اہم سوال تھے:

قرآن کے سامنے دو مراحل تھے

(۱) نزولِ قرآن کے وقت جو غلام اور لونڈیاں عربوں (اور دیگر ممالک) کی معاشرتی اور معاشی زندگی کا جزو بن چکے تھے، ان کیلئے کشود کی راہ۔ اور

(۲) آئندہ کیلئے اس دروازے کا بند کر دینا جہاں سے غلام اور لونڈیاں آتے تھے۔

شقِ اول کے متعلق ظاہر ہے کہ ان تمام غلاموں اور لونڈیوں کو ایک ہی دن میں نابود نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسلام کا منشاء یہ تھا کہ انھیں آزاد کر کے باقی انسانوں کے ہم پہلو کھڑا کر دے لیکن اُن معاشرتی اور معاشی حالات میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، یہ مقصد بتدریج حاصل ہو سکتا تھا۔ اگر ان تمام غلاموں اور لونڈیوں کو (جو اس وقت موجود تھے) آنِ واحد میں آزاد کر کے چھوڑ دیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ وہاں کے معاشرے میں سخت انتشار واقعہ ہو جاتا بلکہ خود ان غلاموں اور لونڈیوں کیلئے بھی عجیب مشکلات کا سامنا ہوتا اور اکثر و بیشتر حالات میں وہ ان خاندانوں کو چھوڑنا ہی نہ چاہتے جن میں وہ گھل مل چکے تھے۔ قرآن نے ان کے متعلق ایسا طریقِ عمل اختیار کیا جس سے وہ آہستہ آہستہ اس آزاد معاشرہ میں جذب ہوتے چلے گئے۔ انھیں حق دیدیا گیا کہ وہ چاہیں تو کچھ فدیہ ادا کر کے پروانۂ آزادی حاصل کر لیں۔ کہیں خود مسلمانوں کو تاکید کر دی کہ وہ بعض کوتاہیوں کے کفارہ کے طور پر غلاموں کو آزاد کر دیں۔ اسی طرح لونڈیوں کو آہستہ آہستہ آزاد عورتوں کا سا درجہ دیدیا۔ جب تک یہ غلام اور لونڈیاں بتدریج جذب نہیں ہو گئے ان سے حسن سلوک کا حکم دیا تاکہ وہ انسانی مراعات سے محروم نہ رہنے پائیں۔ قرآن کریم میں غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق جسقدر احکام ہیں وہ سب انہی کی بابت ہیں جو اس وقت اس معاشرے میں، لونڈی اور غلاموں کی حیثیت سے موجود تھے۔ قرآن میں جہاں جہاں ان کا ذکر ہے ان الفاظ میں ہے کہ "ما ملکت ایمانکم" جو (بطور غلام اور لونڈی) تمہاری ملکیت میں آ چکے ہیں۔ کہیں یہ نہیں کہ "جنھیں تم اس کے بعد لونڈی اور غلام بناؤ"۔ یہ تو ہوا شقِ اول کے متعلق۔ یعنی ان لونڈیوں اور غلاموں کے متعلق جو ظہورِ اسلام کے وقت عربوں کے معاشرے میں موجود تھے۔

آئندہ کیلئے دروازہ بند

اب رہی شقِ دوم۔ یعنی آئندہ کیلئے غلامی کا دروازہ بند کرنا۔ سو اس کے لئے قرآن نے ایسی فصاحت سے حکم دیدیا کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ (اور قرآن کا کونسا حکم ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ بشرطیکہ اسے خالی الذہن ہو کر دیکھا جائے۔ یہ تو ہمارے روایاتی رنگین شیشے ہیں جو اس کی صاف اور شفاف

تعلیم کو بھی زنگدار بنا دیتے ہیں۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مے بے دُرد وصاف　　رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

ایامِ جاہلیت میں غلام اور لونڈیاں جنگ کے قیدیوں کو بنایا جاتا تھا اور بعد میں انھیں فروخت بھی کر دیا جاتا تھا۔ (بعض اوقات بچوں کو چرا کر بھی فروخت کیا جاتا تھا لیکن غلاموں اور لونڈیوں کا اصل سرچشمہ جنگ کے قیدی ہی تھا)۔ جنگ کے قیدیوں کو کیا کیا جائے اس کے متعلق سورۂ محمد میں ہے:

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ۔

جب تمہارا مقابلہ کفار سے ہو تو انھیں تہِ تیغ کرو۔ یہاں تک کہ جب ان میں مقابلے کی طاقت باقی نہ رہے (ان کا زور ٹوٹ جائے) تو بقیۃ السیف لوگوں کو باندھ لو۔

یہ ہوئے اسیرانِ جنگ۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان اسیرانِ جنگ کو

فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (۴۷/۴)

یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔

سارے قرآن میں اسیرانِ جنگ سے متعلق یہی ایک حکم ہے۔ آپ اس حکم کو دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ اس میں کہیں، کسی پہلو سے بھی انھیں غلام بنانے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ یا اس قسم کا گمان بھی گذر سکتا ہے کہ قرآن کا منشا یہ ہے کہ اسیرانِ جنگ کو غلام بناؤ۔ ان کی عورتوں سے جنسی تمتع کرو۔ پھر جی چاہے تو انھیں بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کر دو۔ فروخت ہونے کے بعد وہ نئے خریدار کے غلام بن جائیں اور لونڈیاں اس کے مصرف میں آنے لگ جائیں۔ اور قیامت تک، جب تک ان کے مالک انھیں آزاد نہ کر دیں، وہ نسلاً بعد نسلٍ غلام اور ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم رکھے جائیں۔ غلام کا بیٹا بھی غلام رہے اور ساری عمر ایک پیسے کا مالک نہ ہو سکے (خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو جائے)۔ ذرا سوچئے کہ آیۂ مذکورہ بالا سے کسی صورت میں بھی یہ حکم نکل سکتا ہے؟ قرآن کا حکم بالکل صاف ہے۔ دشمن سے جنگ ہو تو اس صورت میں اسیرانِ جنگ تمہارے قبضے میں آئیں گے۔ یہ جنگ کے قیدی ہوں گے۔ جب تک جنگی مصالح کا تقاضا ہو گا یہ قید میں رکھے جائیں گے۔ اس کے بعد ان کی (DISPOSAL) کا سوال سامنے آئے گا۔ اس لئے قرآن نے دو متبادل صورتیں (ALTERNATIVES) بیان کر دیں۔ یعنی یا فدیہ لیکر (جس میں اپنے قیدیوں کا تبادلہ بھی شامل ہے) یا بطورِ احسان، ان قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ قرآن نے نہ انھیں قتل کرنے کا حکم دیا ہے نہ غلام بنانے کا۔ لیکن مُلا کی شریعت کہتی ہے کہ نہیں! خدا کا یہ حکم نامکمل ہے۔

مُلا کا مذہب

اس کی تکمیل اس اسلام سے ہوتی ہے جسے میں پیش کرتا ہوں۔ اور وہ حکم یہ ہے کہ جو لوگ جنگ میں قید ہوں ان کو یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے۔ یا فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے یا دشمن کے مسلمان قیدیوں سے ان کا مبادلہ کر لیا جائے۔ لیکن اگر یونہی رہا کر دینا جنگی مصالح کے خلاف ہو اور فدیہ وصول نہ ہو سکے اور دشمن اسیرانِ جنگ کا مبادلہ کرنے پر بھی راضی نہ ہو تو مسلمانوں کو حق ہے کہ انھیں غلام بنا کر رکھیں۔ (تفہیمات حصہ دوم از ابوالاعلیٰ صاحب مودودی صفحہ ۲۹۲)

مودودی صاحب اپنی تفسیر (تفہیم القرآن) میں اس سے بھی زیادہ وضاحت سے لکھتے ہیں کہ یہ بات حکومت کے اختیار میں ہے کہ جو صورت چاہے اختیار کرے:

حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) رہا کردے۔ چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے تو انھیں سپاہیوں میں تقسیم کردے اور سپاہی انھیں اپنے استعمال میں لائیں (صفحہ ۳۴۲)

یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم تو صرف اس قدر ہے کہ "فاما منا بعد واما فداء" اسیران جنگ کو بطور احسان رہا کردو یا فدیہ ومعاوضہ لیکر لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ (معاذ اللہ) خدا کا یہ حکم ناقص ہے۔ پورا حکم یوں ہے کہ اسیران جنگ کو چاہے بطور احسان رہا کرو، چاہے فدیہ لیکر چھوڑ دو۔ اور چاہے انھیں غلام بنا کر رکھو اور ان کی عورتوں کو اپنے مصرف میں لاؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ مُلا کے پورے مذہب کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ خدا کا کوئی حکم مکمل نہیں ہوتا۔ اس کی تکمیل دوسرے مقامات سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب اس باب میں صاف صاف لکھتے ہیں کہ

مولف[1] کی غلطی کا اصلی سبب یہ ہے کہ انھوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

(تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۲۹۲)

اس میں کیا شبہ ہے؟ ایک مسلمان کی اس سے بڑی "غلطی" اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ قرآن کو مکمل ضابطہ حیات سمجھتا ہے اور زندگی کے قانون اس سے اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے! یہ "غلطی" ہی نہیں، مُلا کی عدالت میں ایسا جرم عظیم ہے جس کی پاداش میں ایسے مسلمان کو مرتد قرار دیکر حوالۂ دار ورسن کیا جا سکتا ہے! مسلمان اور یہ کوشش کہ صرف قرآن سے قانون اخذ کر لیا جائے! توبہ۔ توبہ۔ کتنا بڑا بہتان ہے خدا کے خلاف، اور کتنی بڑی جسارت ہے قرآن کے خلاف!! معلوم ایسے مسلمان خدا کے سامنے جا کر کیا جواب دینگے جب وہ ان سے پوچھے گا کہ کیا تم نے میری اس کتاب کو مکمل ضابطۂ قانون سمجھ لیا تھا؟ کیا تم نے میرے متعلق ایسا گمان کیا تھا کہ میں مکمل احکام دے سکتا ہوں؟ کیا تم نے میری اس بات کو فی الواقعہ سچ سمجھ لیا تھا کہ

وتمت کلمت ربك صدقا وعدلا۔ لا مبدل لکلمتہ (۶/۱۱۶)

"تیرے رب کے قوانین صدق اور عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئے۔ ان قوانین خداوندی کو کوئی بدل نہیں سکتا۔"

کیا تمہیں اسرار شریعت کے حامل (ملا) بار بار نہیں کہتے تھے کہ خدا کے احکام ناقص ہیں اور اپنی تکمیل کے لئے غیر خداوندی اضافوں کے محتاج ہیں۔ تم اپنی ضد پر اڑے رہے اور ان کی ایک نہ مانی۔ اب کہو تمہارے پاس کیا جواب ہے؟

ملا کے ذہن میں خدا کا کچھ ایسا ہی نقشہ ہے۔

تضاد بیان مودودی صاحب نے یہ کچھ تو حافظ اسلم جیراجپوری صاحب کے جواب میں لکھا لیکن جب کسی نے براہ راست ان سے

---

[1] مولف سے مراد ہیں علامہ اسلم جیراجپوری جن کی تالیف "تعلیمات قرآن" پر تنقید کے سلسلے میں مودودی صاحب نے یہ بحث چھیڑی تھی کہ اسلام میں غلامی کا حکم موجود ہے اور مولف کی یہ سخت غلطی ہے جو لکھتے ہیں کہ اسلام نے غلامی کو منسوخ کر دیا ہے۔

دریافت کیا کہ "لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع شہوت رانی ہے اور اسلام اس کے خلاف ہے" تو آپ نے تحریر فرمایا کہ

ان سوالات کے جواب میں پہلے یہ جان لینا چاہیئے کہ حقِ ملکیت کی بنا پر تمتع کی اجازت قرآن مجید کی متعدد آیات میں صریح طور پر وارد ہوئی ہے۔ بہت سے لوگ اس معاملہ میں بڑی بے باکی کے ساتھ یہ سمجھتے ہوئے اعتراضات کر ڈالتے ہیں کہ یہ شاید "مولویوں" کا گھڑا ہوا مسئلہ ہوگا۔ اور بعض منکرین حدیث اس کو اپنے نزدیک "حدیث کے خرافات" میں سے سمجھ کر زبان درازی کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا ایسے سب لوگوں کو آگاہ رہنا چاہیئے کہ ان کا معاملہ "مولویوں" کی فقہ اور محدثین کی روایات سے نہیں بلکہ خود خدا کی کتاب سے ہے۔ (ایضاً ص۳۰۸)

آپ پہلے اس بیان کو دیکھئے جس میں مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ "مولف کی غلطی کا اصل سبب یہ ہے کہ انھوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش کی ہے"۔ اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ مولوی کا من گھڑت مسئلہ نہیں۔ خود قرآن کا حکم ہے۔ آپ غور فرمایئے کہ کتنا بڑا کھیل ہے جو دین کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے! یعنی جب مصلحت سمجھی یہ کہہ دیا کہ دین، قرآن ہی کے اندر تھوڑا ہے۔ اس کے ساتھ فقہ اور روایات بھی ضروری ہیں۔ اور جب ضرورت دیکھی یہ کہہ دیا کہ ہم فقہ اور روایات سے سند ہی نہیں لاتے۔ ہم قرآن پیش کرتے ہیں۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے قرآن سے وہ آیات نقل کر دی ہیں جو ان غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت موجود تھے اور جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

علامہ اسلم صاحب نے اسیرانِ جنگ کے متعلق قرآن کی آیت نقل کر کے لکھا تھا کہ اس سے قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت کہیں نہیں نکلتی۔ آیت اور اس کا ترجمہ یہ تھا۔

فاما منا بعد واما فداء		پھر یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لیکر

اس ترجمہ کے متعلق مودودی صاحب فرماتے ہیں:

اس کے بعد لفظ منّ قابل غور ہے۔ منّ کے معنی صرف احسان کے ہیں "احسان رکھ کر چھوڑ دو" مترجم کا اپنا اضافہ ہے۔ (ص۳۱۰)

لیکن مودودی صاحب خود ہی دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ

اسلام کا قانون یہ قرار پایا کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوں ان کو یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے۔ . . . . (ص۲۹۲)

اور دوسری جگہ

اسلام نے دنیا کے سامنے یہ اصول پیش کیا کہ جو لوگ جنگ میں قید ہوں ان کو فدیہ لیکر چھوڑ دو۔ یا اسیرانِ جنگ سے مبادلہ کر لو۔ یا بطریقِ احسان رہا کر دو۔ (ص۳۱۱)

یعنی اگر حافظ اسلم صاحب یہ کہیں کہ "احسان رکھ کر چھوڑ دو" تو یہ ان کا اپنا اضافہ ہے۔ اسلام کا قانون نہیں ہے۔ اور جب مودودی صاحب ارشاد فرمائیں کہ "احسان کے طور پر رہا کرو" تو یہ اسلام کا قانون ہے، ان کا اپنا اضافہ نہیں ہے۔

جب میں چلوں تو سایہ بھی میرا نہ ساتھ دے ۔۔۔ جب تم چلو، زمین چلے، آسمان چلے!

قرآن میں احسان کا حکم کہیں نہیں

اس ضمن میں ایک اور چیز بھی بڑی دلچسپ سامنے آتی ہے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

آیت میں منًا کا لفظ ہے جس کے معنی احسان رکھنے کے ہیں اور قرآن میں احسان کا حکم کہیں نہیں دیا گیا۔ (ص۲۹۳)

غور فرمایا آپ نے کہ ملا اپنی بات کی پچ میں کہاں تک جا پہنچتا ہے؟ فرماتے ہیں کہ قرآن میں احسان کا حکم کہیں نہیں دیا گیا۔ یہ اس قرآن کا ذکر ہے جس میں یہ آیت بھی موجود ہے کہ

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان (۱۶/۹۰)

یقیناً اللہ تمہیں عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اللہ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ ورنہ جس ملا کی جرأتوں کا یہ عالم ہے کہ وہ قرآن میں ایسے احکام کی موجودگی میں کہہ دیتا ہے کہ "قرآن میں احسان کا حکم کہیں نہیں دیا گیا"۔ اگر قرآن کہیں اسی کی تحویل میں ہوتا تو معلوم یہ اس کے ساتھ کیا کچھ کرتا!

اس بےبسی میں ذوقؔ یہ عالم بشر کا ہے ۔۔۔ کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے!

دنیا اس مسئلے کا حل کس طرح کرتی ہے؟

مودودی صاحب بار بار یہ فرماتے ہیں کہ اگر فریق مخالف اپنے قیدیوں کو چھڑائے نہیں۔ اور قیدیوں میں زرِ فدیہ دیکر آزاد ہونے کی استطاعت نہ ہو تو اس صورت میں ان قیدیوں کو کیا کیا جائے! لیکن ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انھیں غلام بنا لیا جائے اور ان کی عورتوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا جائے۔ دنیا میں آئے دن جنگیں ہوتی ہیں۔ ان میں قیدی بھی پکڑے جاتے ہیں۔ ان قیدیوں سے متعلق مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ خود ہماری آنکھوں کے سامنے دو مہیب اور عظیم جنگیں ہو چکی ہیں جن میں قیدیوں کی مجموعی تعداد کروڑوں تک پہنچ چکی تھی۔ کیا ان قوموں میں سے کسی کا ذہن بھی اس طرف گیا کہ ان قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر انھیں ٹکے ٹکے پر فروخت کرنا چاہیے؟ ان کفار اور مشرکین کا ذہن تو اس طرف نہ گیا لیکن یہ ہمارے مفتیانِ شریعت ہیں (جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا نظامِ زندگی، انسانوں کا وضع کردہ نہیں، خود خدا کا عطا فرمودہ ہے۔ اور اس کی مثل اور نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی) جب ان کے سامنے یہی سوال آتا ہے تو انھیں اس کے سوا کوئی عملی شکل نظر ہی نہیں آتی کہ ان قیدیوں کو غلام بنا کر فروخت کیا جائے! اور

ان کی عورتوں کو اپنے استعمال میں لایا جائے۔

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!

قرآن اس مسئلہ کا حل صاف بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک تمہارے مصالح کا تقاضا ہو، ان قیدیوں کو قیدیوں کی طرح رکھو۔ اور چونکہ یہ قیدی انسان ہیں، اسلئے ان سے انسانیت کا سلوک کرو، اس کے بعد جب ان کے آزاد کرنے کا سوال سامنے آئے تو تمہیں اجازت ہے کہ ان کے مبادلے میں اپنے قیدی چھڑا لو۔ یا اگر فریق مخالف کے ہاں تمہارے قیدی نہ ہوں (یا کم مقدار میں ہوں) تو زرِ فدیہ لیکر آزاد کردو۔ اور یہ بھی اجازت ہے کہ انھیں بطور احسان چھوڑ دو۔ جو صورت مناسب نظر آئے اس کے مطابق عمل کرو۔ حتیٰ تضع الحرب اوزارھا (۴۷) یہانتک کہ خود جنگ اپنے ہتھیار رکھدے۔ یعنی تمہارا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ دنیا سے جنگ کا سلسلہ ختم ہوجائے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ تم جنگ کے قیدیوں کے ساتھ ایسا سلوک کرو کہ آئندہ وہ تمہارے خلاف ہتھیار ہی نہ اٹھائیں۔ اور مخالف قوموں سے اس قسم کا احسان مندانہ سلوک کرو کہ تمہارے سامنے ان کا سرِ تسلیم خود ہی خم ہوجائے۔ یہ تھا قرآن کا منشاء۔ لیکن ہمارے ملا کا مذہب یہ ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام بناؤ اور ان کی عورتوں سے شہوت رانی کرو تاکہ دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہوجائے"۔

بالکل درست فرمایا۔ جن لوگوں سے اس قسم کا سلوک ہوگا وہ آئندہ دشمنی پر آمادہ ہی نہیں ہو سکیں گے؟ وہ تو ایسی قوم کے بے دام غلام بن جائیں گے!

چونکہ غلامی کا تصور ہی ایسا ہے کہ اس سے انسان کے احساسِ انسانیت کو ٹھیس لگتی ہے (بشرطیکہ یہ احساس اندھی تقلید کے افیونی اثر سے مفلوج یا مصلحت کوشیوں سے مجبوب نہ ہوچکا ہو) اس لئے مودودی صاحب کے پاس اس کے خلاف بہت سے اعتراضات پہنچے۔ ان اعتراضات کو دیکھکر مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

جنگ میں گرفتار ہونے والے سبایا (لونڈی غلاموں) کے حق میں اسلام نے جو قوانین وضع کئے تھے ان کو سمجھنے میں آج لوگوں کو اسلئے دقتیں پیش آرہی ہیں کہ اس زمانے میں وہ حالات باقی نہیں رہے جن کیلئے یہ قوانین وضع کئے گئے تھے۔ (ص۳۰۹)

اس اقتباس سے بظاہر ایسا مترشح ہوتا ہے کہ مودودی صاحب بھی وہی بات کہتے ہیں جسے ہم نے شروع میں پیش کیا ہے یعنی یہ کہ قرآن میں "ماملکت ایمانکم" (لونڈی غلاموں) کے متعلق جو احکام ہیں وہ ان لونڈیوں اور غلاموں کی بابت ہیں جو اس وقت عربی معاشرے میں موجود تھے۔ جب وہ غلام باقی نہ رہے تو یہ احکام بھی ختم ہوگئے۔ (البتہ اس کے بعد اگر پھر کوئی ایسی صورت پیدا ہوجائے۔ یعنی کوئی ایسی قوم اسلام لے آئے جس میں پہلے سے لونڈی غلام موجود ہوں۔ یا خود مسلمانوں کی وہ سلطنتیں جن میں لونڈی اور غلاموں کو روا رکھا گیا تھا، یا آج بھی روا رکھا جاتا ہے۔ مثلاً حجاز کی "مقدس" سرزمین اور وہاں کی "خالص اسلامی" حکومت میں —— پھر قرآن کی طرف رجوع کریں تو اس وقت پھر وہی احکام نافذ العمل ہوجائیں گے جو زمانۂ بعثتِ نبی اکرمؐ میں نافذ ہوتے تھے) لیکن درحقیقت مودودی صاحب **یہ احکام اب بھی موجود ہیں** اس سے بالکل مختلف بات کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آج بھی جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی

عورتوں کو لونڈیاں بنایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ تشکیلِ پاکستان کے بعد جب مودودی صاحب نظامِ شریعت کی تنفیذ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان سے (۱۹۴۸ء میں) پوچھا گیا کہ

> کیا نظامِ شریعت میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانے کی اجازت ہوگی۔ اور کیا اُن غلام اور لونڈیوں کو فروخت کرنے کا بھی حق ہوگا۔ (ص ۳۲۱)

تو انھوں نے کہا کہ ہاں! نظامِ شریعت میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے وہ حالات بتائے جن میں جنگی قیدی غلام بنائے جاسکتے ہیں اور وہ "دلائل" دیئے جن کی روسے (مودودی صاحب کے نزدیک) یہ احکام عین مبنی بر حکمت ہیں۔ اگر کسی کو شک ہو تو وہ مودودی صاحب سے پھر دریافت کرلے کہ جس نظامِ شریعت کو وہ رائج کرنا چاہتے ہیں اس میں جنگی قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنانے کی اجازت ہوگی یا نہیں۔ ان کی تفسیر (تفہیم القرآن) حال میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں جنگ میں قید شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنا کر سپاہیوں میں تقسیم کرنے کا حکم مستقلاً موجود ہے۔ (اقتباس اوپر دیا جاچکا ہے۔ تفصیل جس کا جی چاہے وہاں دیکھ لے) اور یہ اس لئے کہ از منۂ سلف کے شاہی درباروں میں وضع شدہ شریعت میں وہ معاشرہ کس کام کا جس میں لونڈیاں ہی نہ ہوں!

اب وہ دلائل ملاحظہ فرمائیے جن کی روسے غلامی کو عین مطابق حکمتِ الٰہیہ قرار دیا جارہا ہے۔ فرماتے ہیں:

غلامی کے حق میں دلائل

> نظامِ شریعت میں جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانے کی اجازت ایسی حالت میں دی گئی ہے[1] جب کہ وہ قوم جس سے ہماری جنگ ہو نہ قیدیوں کے تبادلے پر راضی ہو، نہ فدیہ لیکر ہمارے قیدیوں کو چھوڑے اور نہ فدیہ دیکر اپنے قیدی چھڑائے۔ آپ غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں جو قیدی کسی حکومت کے پاس رہ جائیں وہ یا تو انھیں قتل کرے گی یا انھیں عمر بھر اس قسم کے انسانی باڑوں میں رکھے گی جنھیں آج کل (CONCENTRATION CAMPS) کہا جاتا ہے اور کسی قسم کے انسانی حقوق دیئے بغیر ان سے جبری محنت لیتی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت زیادہ بے رحمانہ ہے.... اسلام نے ایسے حالات کے لئے جو شکل اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ ان قیدیوں کو فرداً فرداً مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کی ایک قانونی حیثیت متشخص کر دی جائے۔ (ص ۳۲۲)

سوال یہ نہیں کہ "کوئی حکومت" ان حالات میں جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ سوال یہ ہے کہ نظامِ شریعتِ اسلامیہ کی حامل حکومت ان حالات میں کیا کرے گی۔ کیا ان کے ہاں بھی اس قسم کے (concentration camps) ہوں گے جن میں قیدیوں کو کسی قسم کے انسانی حقوق دیئے بغیر ان سے جبری محنت لی جائیگی؟ کیا اس نظامِ شریعت میں انسانوں کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرنے کی کوئی پابندی نہیں ہوگی؟ کیا اس میں قیدیوں کو "شاہی مہمان" (state guests) کی صورت میں رکھنے کی کوئی اجازت نہیں ہوگی؟ گیا وہ نظام ایسا ہی ہوگا کہ اس میں جنگی قیدی شکر کریں گے کہ انھیں غلام بنا لیا گیا ہے ورنہ نہ جانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس نظامِ شریعت میں انسانوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک روا رکھا جائے گا کہ اس سلوک کے

---

[1] اس سے بھی ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک یہ اجازت آج بھی موجود ہے اگر وہ حالات پیدا ہو جائیں جن کا انھوں نے ذکر کیا ہے۔ طلوعِ اسلام۔

مقابلے میں غلامی گویا ان کے حق میں بہت بڑا احسان ہوگی! کیا یہی ہوگا وہ نظامِ شریعت جس کے متعلق ہم ساری دنیا کو کہتے چلے آرہے ہیں کہ وہ عرش سے اترا ہوا ہے؟

پھر یہ دیکھئے کہ بجائے اس کے کہ ہم ان (concentration camps) کی اصلاح کا کوئی طریقہ سوچیں اور دنیا سے کہیں کہ جنگی قیدیوں سے انسانوں جیسا سلوک کرو۔ ہم ان سے کہتے ہیں تو یہ کہ "اسلام" نے اس خرابی کا یہ حل بتایا ہے کہ ان کے مردوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں؟ سبحان اللہ! کیسی "آسمان سے نازل شدہ" اصلاح ہے! انسانیت اس حسنِ سلوک پر ناز کرے گی اور دنیا کے قیدی اس احسانِ عظیم پر سجدہ ریز ہوں گے جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے کہ ان کی بیویاں، بیٹیاں، بہنیں، ان "مصلحین و مشفقین" کی ہوس رانیوں اور عیش جوئیوں کا شکار بن رہی ہیں۔ وہ شکر کریں گے کہ ان سے جبری محنت نہیں لی جارہی . . . . صرف ان سے جبری . . . . کیا جارہا ہے؟

مودودی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ غلام بنانے سے ان کی قانونی حیثیت متشخص ہوجاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ قانونی حیثیت کیا ہے؟

(i) غلام اپنی کمائی کے ایک پیسے کا بھی مالک نہیں بن سکتا۔

(ii) غلام کا بیٹا بھی غلام ہوتا ہے (حتیٰ کہ اگر غیر مسلم غلام مسلمان بھی ہوجائے وہ تب بھی غلام ہی رہتا ہے)

(iii) جب مالک کا جی چاہے اُسے، جس کے ہاتھوں جی چاہے فروخت کردیا جاسکتا ہے۔

(iv) غلام عورت (یعنی لونڈی) سے بلا نکاح جنسی تعلقات قائم کئے جاتے ہیں۔ اس میں تعداد کا بھی کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔

(v) جس لونڈی سے اس طرح جنسی تمتع کیا جائے، اس کا درجہ "شریف بیبیوں" جیسا نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس کی اولاد پر بھی پرستارزادگی کا داغ رہتا ہے۔

(vi) لونڈیوں کے ساتھ ہم بستری کی صورت میں عزل (withdrawal) بھی کیا جاسکتا ہے اور لواطت بھی (اس کی تفصیل اور سند آگے آتی ہے)

(vii) اور جب جی بھرجائے تو لونڈی کو کسی دوسرے کے پاس فروخت بھی کیا جاسکتا ہے۔

دیکھ لیا آپ نے کہ کتنی بڑی ہے یہ قانونی حیثیت جو غلاموں اور لونڈیوں کو عطا فرمائی جارہی ہے!

عورتوں پر احسانِ عظیم

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کیلئے . . . . اس سے بہتر حل اور کیا ہوسکتا ہے کہ جو عورت حکومت کی طرف سے جس شخص کی ملکیت میں دی جائے اس کے ساتھ اس شخص کو جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دیدیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلانے کا ایک مستقل ذریعہ بن جائیں۔ (ص ۳۲۳)

یعنی اگر کسی معاشرے میں ایک ایک شخص، دس دس بیس بیس عورتیں سنبھال لے۔ ان کے ساتھ، ان کی مرضی کے خلاف، جنسی تعلقات قائم کرلے۔ پھر جب جی چاہے انھیں کسی دوسرے کی طرف منتقل کردے اور اس کی قیمت بھی اپنی ہی جیب میں ڈالے۔ تو یہ سب کچھ، ماشاءاللہ، پاکیزگیٔ اخلاق میں داخل ہے۔ اور اگر ان عورتوں کو اس طرح آپس میں نہ بانٹا جائے اور نہ ہی اس طرح ان کی خرید و فروخت کی جائے تو وہ سوسائٹی میں "مستقل بداخلاقی" پھیلانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ ہر وہ بداخلاقی جسے مُلا کی بارگاہ سے جواز کا فتویٰ مل جائے، عین اخلاق ہے۔ اس کے سوا "اخلاق" اور "بداخلاقی" کی تعریف (definition) اور کیا باقی رہ جاتی ہے! چنانچہ اس کی مزید تشریح خود مودودی صاحب نے کردی ہے۔ ان پر اعتراض یہ کیا گیا کہ

> لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع محض شہوت رانی ہے اور اسلام اس کے خلاف ہے۔ (ص ۳۰۷)

نکاح کی ضرورت نہیں

اعتراض سن لیا۔ اب جواب ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

> اس میں بظاہر جو کراہت نظر آتی ہے وہ محض ایک وہمی کراہت ہے۔ چونکہ طبیعتیں نکاح کے عام اور معروف طریقے کی خوگر ہوچکی ہیں اس لئے لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت اور مرد کا صرف وہی تعلق جائز ہے جس میں قاضی صاحب آئیں۔ دو گواہ ہوں۔ ایجاب و قبول ہو۔ خطبۂ نکاح پڑھا جائے۔ اس کے سوا جو صورت ہے وہ محض شہوت رانی ہے۔ لیکن اسلام کوئی رسمی (CONVENTIONAL) مذہب نہیں بلکہ ایک عقلی (RATIONAL) مذہب ہے۔ وہ رسم کو نہیں حقیقت کو دیکھتا ہے۔ نکاح سے ایک عورت جو ایک مرد کیلئے حلال ہوتی ہے تو آخر اسی بنا پر تو حلال ہوتی ہے کہ اللہ کے قانون نے اسے حلال کیا ہے۔ اسی طرح اگر ملک یمین کی بنا پر اللہ کا قانون اسے حلال کرے تو اس میں کراہت کی کونسی بات ہے۔ (ص ۳۱۵)

لیجئے! معترض صاحب لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع پر ہی چیں بجبیں ہو رہے تھے، مودودی صاحب کے نزدیک اصلاً نکاح ہی غیر ضروری ہے۔ لونڈیوں کی بات تو بعد میں آئے گی۔ اس سے ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔

> زید کسی ایسی عورت سے، جس سے قرآن کی رو سے نکاح کیا جاسکتا ہے، عورت کی مرضی سے، تعلقات زناشوئی قائم کرتا ہے۔ وہ دونوں باہمی رضامندی سے اسی طرح رہتے ہیں لیکن نکاح نہیں کرتے۔

سوال یہ ہے کہ کیا شریعت کی رو سے ان کا یہ جنسی تعلق جائز ہوگا یا ناجائز۔ اور ان کی اولاد، حلال کی اولاد قرار پائیگی یا حرام کی۔

مودودی صاحب کے نزدیک یہ تعلقات بالکل جائز ہیں۔ جو لوگ اس قسم کے تعلق (بلا نکاح) کو شرعاً ناجائز سمجھتے ہوں وہ مودودی صاحب سے خود بات صاف کرلیں۔ ہم تو سر دست لونڈیوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے لہذا اپنی بات کو انہی تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ جنسی حلت و حرمت کے متعلق یہ سمجھ لینا نہایت ضروری ہے کہ ہر وہ عورت جسے خدا نے حلال کردیا ہے از خود حلال نہیں ہوجاتی۔ اس کیلئے ایک اہم شرط اور بھی ہے۔ اور وہ شرط اسی طرح لاینفک ہے جس طرح خدا کی طرف سے حلت کی شرط۔ اور یہ شرط ہے خود عورت کی رضامندی۔ مثلاً خدا نے زید پر اس کے چچا کی لڑکی حلال قرار دی ہے۔ (یعنی قرآن کی رو سے زید کا نکاح اس کی چچیری بہن سے ہوسکتا ہے) لیکن یہ لڑکی محض خدا کے حلال قرار دیدینے سے زید کے لئے حلال نہیں ہوجاتی۔ اس کے لئے خود اس لڑکی کی رضامندی (کہ وہ زید کی

بیوی بنانا چاہتی ہے) بھی لاینفک ہے۔ اگر وہ لڑکی اس پر رضامند نہیں ہوتی تو وہ (خدا کے حلال کرنے کے باوجود) زید پر حرام ہی رہے گی۔
لہٰذا جنسی تعلقات کے جائز ہونے کے لئے دو شرطیں لاینفک ہیں۔

ؔ اول — اس عورت کو خدا نے حلال قرار دیا ہو۔ اور
دوم — وہ عورت، تعلقاتِ زناشوئی پر رضامند ہو۔

اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو تو وہ تعلقات حرام ہوں گے اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اگر عورت رضامند نہ ہو تو خدا کی حلال کردہ بھی حلال نہیں ہوتی۔

اب یہ سوچئے کہ کیا لونڈی سے تعلقات کی صورت میں یہ دوسری شرط پوری ہوتی ہے؟ کیا لونڈی سے اس کی رضامندی کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کئے جاتے ہیں؟ (ظاہر ہے کہ اس میں اس کی رضامندی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ جس کے حصے میں آجائے اور جس کے ہاتھوں فروخت ہو جائے اُسے اس سے بہرحال ہم بستر ہونا پڑے گا۔

اب آپ غور فرمائیے کہ دنیا کا کوئی ضابطۂ اخلاق بھی ایسا ہے جو اس قسم کے تعلقات کو جائز قرار دیدے؟ خدا کے ضابطۂ قوانین کو تو چھوڑیئے، کیا یورپ کے ملحدین، کفار اور مشرکین کے ہاں بھی اس قسم کے جنسی تعلقات کو جائز قرار دیا گیا ہے؟ ان تعلقات کو تو ان لوگوں کے ہاں بھی زنا (RAPE) ہی قرار دیا جاتا ہے، لیکن قیامت ہے کہ ایسے تعلقات کو اگر روا رکھا جاتا ہے تو اس دین کے (نام نہاد) پیروؤں کے ہاں جو دنیا میں مکارمِ اخلاق کا بلند ترین ضامن اور عصمت و عفت کا حصن حصین واقع ہوا ہے۔ اور قیامت بالائے قیامت کہ اس زبردستی کے جنسی تعلقات کی اجازت کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذات رسالتمآبؐ کی طرف جو دنیا میں پاکیزگیٔ اخلاق، عفتِ نگاہ اور تطہیرِ فکر و عمل کے سب سے بڑے معلم اور علمبردار تھے! اب اس کے بعد سوائے اس کے کہ انسان اپنا سر پیٹ کر بیٹھ جائے اور کیا کر سکتا ہے۔ غور کیجئے کہ عجم کی ان سازشوں نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا رکھا ہے۔ یعنی وہ باتیں جنہیں ملحدین و مشرکین کے ہاں بھی شرمناک تصور کیا جاتا ہے، وہ ہمارے "مذہب" کا جزو بنا کر رکھدی گئی ہیں اور انہیں خدا اور رسول کی طرف منسوب کیا جاتا ہے!

کوئی حد مقرر نہیں!

اب آگے بڑھیئے۔ مودودی صاحب کے سامنے جب یہ اعتراض پیش کیا گیا کہ

اسلامی شریعت میں نکاح کیلئے تو چار کی حد مقرر ہے۔ . . . . لیکن لونڈیوں کے لئے سرے سے کوئی حد رکھی ہی نہیں۔

اس کی کیا وجہ ہے۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اجازت نے چار کی حد مقرر کرنے کے سارے فوائد کو باطل کر دیا۔ اس نے خوشحال

ؔ معروف شرطیں تین ہیں:
(۱) خدا نے اس عورت کو حلال قرار دیا ہو۔
(۲) مرد اور عورت کی باہمی رضامندی ہو۔ اور
(۳) اور اس رضامندی کا اظہار نکاح کی رو سے کیا جائے۔
چونکہ تیسری شرط کو خود مودودی صاحب نے غیر ضروری قرار دیدیا ہے اس لئے ہم ان سے صرف پہلی دو شرطوں کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

لوگوں کیلئے بے تحاشا عیاشی کا دروازہ کھول دیا اور امراء و رؤسا کیلئے یہ گنجائش نکال دی کہ بے شمار عورتوں کو خرید کر گھروں میں ڈال لیں اور خوب دادِ عیش دیں۔ یہ کچھ مفروضہ ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی پچھلی تاریخ میں عملاً یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ (ص ۳۱۹)

تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ

لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کی قید اسلئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آسکتی ہیں بالفرض اگر ایسی عورتوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو جائے تو اس سوسائٹی میں انھیں کھپانے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ جبکہ لونڈیوں سے تمتع کیلئے تعداد کا تعین پہلے ہی کر دیا گیا ہو۔ (ص ۳۲۴)

لیکن اگر آپ سے کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ منکوحہ عورتوں کی صورت میں آپ کے ہاں چار تک کی تعداد متعین ہے۔ اور اس کا جواز بھی آپ ہی پیش کرتے ہیں کہ جب عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جائے تو اس طرح انھیں سوسائٹی میں کھپایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو جائے کہ سوسائٹی میں عورتوں کی تعداد بہت بڑھ جائے تو اس صورت میں آپ کیا کرینگے؟ آپ کی مذکورہ صدر دلیل سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ منکوحہ عورتوں کے باب میں اللہ نے جو آخری حد مقرر کر دی ہے اس میں (معاذ اللہ) دور اندیشی سے کام نہیں لیا گیا۔ دور اندیشی پر مبنی تو ملّاہی کا قانون ہے جس میں لونڈیوں کی تعداد کی کوئی حد نہیں مقرر کی گئی بلکہ اصول یہ رکھا گیا ہے کہ

جو ہو چمن میں وفورِ گل کا، تو اور دامن دراز ہو جا۔

اور اگر (بقول مودودی صاحب) لونڈیوں سے متعلق قانون بھی خدا ہی کا بنایا ہوا ہے تو یہ عجیب چیز ہے کہ منکوحہ بیویوں کی صورت میں تو اس کا خیال نہ رکھا گیا کہ اگر عورتوں کی تعداد اس سے بھی بڑھ گئی تو کیا کیا جائیگا، اور لونڈیوں کے معاملے میں اس کا خاص خیال رکھا گیا؟

ذہنی آوارگی

انسان اپنی ہوس کاریوں کیلئے بھی کیسے کیسے مقدس بہانے تراشتا ہے! اس کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں؛

رہا آپ کا یہ شبہ کہ لونڈیوں کی ان گنت تعداد سے تمتع کرنے کی اجازت ذہنی آوارگی کا دروازہ کھولتی ہے اور یہ کہ لونڈیوں کے قابلِ بیع و شریٰ ہونے کی وجہ سے اس کا امکان ہے کہ مالدار لوگ لونڈیاں خرید خرید کر ایک پورا بیڑہ فراہم کر لیں اور اپنے گھروں کو عیاشی کا اڈا بنا کر رکھ دیں۔ تو یہ اور اس نوعیت کے اکثر شبہات عموماً اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ معاملہ کا ایک ہی پہلو نگاہ کے سامنے ہوتا ہے اور دوسرے پہلو چھپے رہتے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ شارع نے اپنا قانون انسانی بھلائی کیلئے بنایا ہے اور اس قانون میں جو سہولتیں اور گنجائشیں رکھی ہیں وہ ان حقیقی ضرورتوں کیلئے رکھی ہیں جو عموماً انسان کو پیش آتی ہیں یا پیش آسکتی ہیں۔ اگر بعض لوگ ان گنجائشوں سے اس قسم کے غلط فائدے اٹھاتے ہیں جن کیلئے دراصل شارع نے یہ گنجائشیں نہیں رکھی تھیں تو یہ ان کی اپنی نافہمی ہے یا شرارتِ نفس لیکن اس قسم کی انفرادی غلطیوں کے امکان یا وقوع سے ڈر کر قانون میں ایسی تنگی پیدا کرنا جس سے عام لوگوں کی حقیقی ضرورتیں پوری ہونے میں مشکلات واقع ہوں کسی حکیم کا کام نہیں ہو سکتا۔ (ص ۳۲۰)

اسی ضمن میں آپ دوسری جگہ لکھتے ہیں؛

بعد کے زمانے میں امراء و رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنا لیا وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشاء کے خلاف تھا۔ (ص ۳۲۴)

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب قوم میں لونڈیاں دھڑا دھڑ آرہی ہوں۔ ان کی تعداد کی بھی کوئی حد مقرر نہ ہو۔ وہ ایک دوسرے کی طرف منتقل بھی کی جا سکتی ہوں تو پھر وہ کونسی "عیاشی" ہے جسے آپ شریعت کی منشاء کے خلاف کہہ سکتے ہیں۔ جسے لونڈی مل جائے (خواہ حکومت کی طرف سے یا قیمتاً) اور "شریعت" اس سے

جنسی تعلقات کی اجازت دیتی ہو۔ تو پھر اس لونڈی سے تمتع، عیاشی کا حیلہ کسطرح بن جائیگا۔ عیاشی کے سامان تو خود فراہم کر دیئے جائیں اور پھر ان سے مستفید ہونے والوں پر الزام دھرا جائے مورد الزام اس سامان عیاشی کو فراہم کرنے والے ہیں یا ان سے متمتع ہونے والے؟
اس ضمن میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

> کوئی رئیس اگر عیاشی کرنا چاہے اور قانون کے منشا کے خلاف قانون کی گنجائشوں سے فائدہ اٹھانے پر اتر آئے تو نکاح کا ضابطہ بھی کب اس کے لئے رکاوٹ بن سکتا ہے۔ وہ روز ایک نئی عورت سے نکاح کر سکتا ہے اور دوسرے دن اسے طلاق دے سکتا ہے (ص۳۲۲)

یہ صورت بھی اسی "شریعت" کی رو سے ممکن ہے جو ملّا کی خود ساختہ ہے۔ قرآنی شریعت میں طلاق دیدینا ایسا کھیل نہیں کہ نیلام کنندہ کی طرح ایک، دو، تین کہا اور بیوی کو ٹھوکر مار کر نکال دیا۔ قرآنی طلاق کے لئے کئی مراحل طے کرنے کے بعد عدالت سے فیصلہ لینا ہوگا۔ اس میں یہ مذاق نہیں ہوگا کہ گھر بیٹھے ہی طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہا اور معاملہ ختم کر دیا۔

لونڈیوں کا فروخت کرنا

اس کے بعد مودودی صاحب اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ لونڈیوں کو فروخت کرنا نہایت ذلت آمیز فعل ہے۔ فرماتے ہیں۔

> اس قسم کے لونڈی غلاموں کے بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے .... فدیہ وصول کرنے، اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لیکر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ قانون میں یہ گنجائش جس مصلحت سے رکھی گئی ہے اس کو آپ پوری طرح اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جبکہ کسی دشمن فوج کے سپاہی کو بطور قیدی رکھنے کا آپ کو اتفاق ہوا ہو۔ فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں۔ اور اس طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا بھی کوئی کھیل نہیں۔ اگر کسی شخص کے لئے یہ گنجائش نہ چھوڑی جاتی کہ جس قیدی مرد یا عورت سے وہ عہدہ برآنہ ہو سکے اس کے حقوق ملکیت کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دے تو یہ لوگ جس کے بھی حوالے کئے جاتے اس کے حق میں بلائے جان بن جاتے (ص۳۲۳)

سرت گردم! کیا دلیل ہے!! یعنی دشمن کے قیدیوں سے کام لینا بہت مشکل ہے۔ اور ان کی عورتوں کا گھروں میں رکھنا بیحد پُرخطر لیکن انہی قیدیوں کو جب غلام بنا لیا جائے تو پھر یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اور جب ان کی عورتوں سے ان کے مردوں کے سامنے، ان کی مرضی کے خلاف جنسی تعلقات قائم کئے جائیں تو اس سے وہ تمام خطرات دور ہو جاتے ہیں جو دشمن قوم کے افراد ہونے کی وجہ سے ان کی طرف سے پیش آسکتے تھے۔ اس سے فی الواقعہ ان کے جذبات عداوت محبت میں بدل جائینگے۔

اب رہا یہ کہ جب یہ غلام اور لونڈیاں کسی ایک کے لئے وبال جان بن جائیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ انہیں دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے۔ تو یہ فروخت کردہ غلام اور لونڈیاں اپنے نئے مالک کے لئے "واقعی" عین راحت بن جائینگے؟ اس سے انکی دلی اُنس پیدا ہو جائیگا؟ اور اسی طرح جب وہ انہیں تیسرے کے ہاتھ فروخت کر دیگا تو اس نئے مالک سے اور بھی زیادہ محبت ہو جائیگی! ان کی دشمنی تو دراصل پہلے ہی سے تھی جس نے انہیں مفت حاصل کر لیا تھا۔ جنہوں نے دام دیکر خریدا ہو ان سے دشمنی کرتے ہوئے انہیں شرم نہیں آئیگی؟

اگر غیر مسلم بھی یہی کریں تو؟

اب آئیے اس اعتراض کی طرف کہ

غیر مسلم محارب قومیں اگر گرفتار شدہ مسلمان عورتوں کے ساتھ یہی سلوک کریں تو عقلاً اس کے خلاف مسلمانوں کو احتجاج کا کیا حق ہے (ص ۳۰۸)

اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

> رہا آپ کا آخری سوال، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال کرتے وقت آپ نے یہ فرض کر لیا تھا کہ دشمن کے قبضے میں جو مسلمان عورتیں جاتی ہونگی ان کو وہ بالکل گھر کی بیٹیاں بنا کر رکھتے ہونگے مگر کیا آپ کا یہ مفروضہ صحیح ہے؟ اور آپ کا یہ کہنا کہ اس پر ہمیں احتجاج کا کیا حق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم تو عورتوں ہی کو نہیں مردوں کو بھی غلام بنا کر رکھنا نہ چاہتے تھے۔ اگر دشمن اسیرانِ جنگ کے تبادلے پر راضی ہوتے تو ہم ان کے ایک مرد یا ایک عورت کو بھی اپنے پاس غلام بنا کر رکھنے پر اصرار نہ کرتے۔ لہذا اگر صدیوں تک دنیا میں غلامی کا رواج رہا اور ایک قوم کی شریف عورتیں لونڈیاں بن بن کر دوسری قوموں کے تصرف میں آتی رہیں تو یہ ہمارے قصور کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس کے ذمے دار وہ لوگ تھے جو صدیوں تک اسیران جنگ کے بارے میں کسی مہذب اور معقول رویّے کو اختیار کرنے پر راضی نہ ہوئے (ص ۱۹-۳۱۸)

یہ عبارت کچھ مبہم سی ہے۔ لیکن اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب دوسری قومیں ہماری عورتوں کو لونڈیاں بنائینگے تو ہم ان کی عورتوں کو لونڈیاں کیوں نہ بنائیں! یعنی اسلام کے اپنے اصول کچھ نہیں۔ جو کچھ دوسرے ان سے کریں یہ وہی کچھ ان سے کرلیں۔ بس یہ ہے اصول۔ وہ ان کے ہاں ڈاکے ڈالیں تو اس کے جواب میں یہ بھی ان کے ہاں ڈاکے ڈالنا شروع کردیں۔ وہ ان سے جھوٹ بولیں تو یہ بھی ان سے جھوٹ بولیں۔ وہ ان سے بے ایمانی (بددیانتی) کریں تو اس کے جواب میں یہ بھی ان سے بے ایمانی شروع کردیں وہ ان کی راہ چلتی عورتوں کو چھیڑیں یا اٹھالیں تو یہ بھی ان کی عورتوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کردیں اور انہیں زبردستی اٹھالیں۔ وہ ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنائیں تو یہ بھی ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنالیں! یہ ہوگا مسلمانوں کا اصولِ زندگی اور مسلکِ حیات یہ ہوگا ان کا نمونہ دوسری قوموں کے ساتھ معاملات کے بارے میں! کیسے زرّیں ہیں یہ اصول اور کسقدر بلند ہے یہ مسلک! ایسی قوم کا مسلک و مشرب بتایا جا رہا ہے جس کا خدا ان سے کہتا ہے کہ ان مشرکین کے بتوں کو بھی گالی نہ دو مبادا یہ بھی تمہارے خدا کو گالی دیدیں۔ جس کا قرآن ان سے کہتا ہے کہ لایجرمنکم شنآن قوم علیٰ ان لا تعدلوا۔ اعدلوا۔ کسی قوم سے تمہاری دشمنی تمہیں کہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ تم ان سے بہرحال اور بہرکیف عدل کرو۔ عدل و انصاف کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ وہ اگر ذلیل حرکات پر اتر آئیں تو تم اپنا بلند مقام چھوڑ کر ان کی پست سطح پر نہ آجاؤ۔ تمہیں تو شاھد علی الناس پیدا کیا گیا ہے۔ تمہیں ساری دنیا کے لئے مکارم اخلاق اور حسن آئین کا نمونہ بننا ہے۔ اگر تم بھی جوشِ انتقام میں انہی جیسی بیہودہ حرکتیں کرنے لگ گئے تو ان میں اور تم میں فرق کیا رہا!

معترض کا اعتراض

لیکن معترض کا اعتراض ہنوز اپنی جگہ پر ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ آج اقوام عالم میں کسی کے یہاں بھی یہ قانون نہیں کہ جنگ کے قیدیوں میں عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کرکے ان کی خرید و فروخت شروع کردی جائے

لیکن (مودودی صاحب کے کہنے کے مطابق) اسلامی شریعت میں یہ شق موجود ہے۔ اب اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ کسی جنگ میں مسلمانوں کی عورتیں دشمن کے ھاں قید ہوں اور ان کی عورتیں مسلمانوں کے ھاں۔ دشمن اپنے قیدیوں کا مبادلہ نہ کرے نہ ہی زر فدیہ دیکر انہیں چھڑائے۔ تو ایسے حالات میں (مودودی صاحب کی شریعت کے مطابق) مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ وہ ان قیدی عورتوں سے جنسی تعلقات قایم کریں۔ معترض کا کہنا ہے کہ ان حالات میں اگر دشمن مسلمانوں کی طرف سے پہل ہونے کے بعد جیسے وہ اپنی "شریعت" کے مطابق کرینگے) مسلمانوں کی عورتوں سے بھی اس قسم کی حرکت کرنے لگ جائے تو اس صورت میں مسلمانوں کو یہ حق تو نہیں ہوگا کہ وہ دشمن کے اس رویے کے خلاف احتجاج کرسکیں۔ مودودی صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا حالانکہ (مودودی صاحب کے انداز فکر اور پیش کردہ مسلک کے مطابق) اس کا جواب واضح تھا کہ اسلام کے قوانین عالمگیر ہیں۔ اور مسلمانوں کی تمام جدوجہد کا ماحصل یہ ہونا چاہیئے کہ اسلام کے قوانین ہر جگہ عام ہو جائیں۔ اور اگر کوئی قوم وہی قانون اپنی ہاں نافذ کرتی ہے جو مسلمانوں کے نظام شریعت میں موجود ہے تو یہ بات مسلمانوں کے لئے باعث مسرت اور وجہ صد افتخار ہوگی۔ لہذا اگر دنیا کی کوئی قوم (مسلمانوں کی طرف سے پہل ہونیکے بعد) ان کی قیدی عورتوں سے اس قسم کی نازیبا حرکت شروع کردیگی، تو مودودی صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات کے لئے یہ مقام ہزار مسرت و شادمانی کا ہوگا۔ کہ ان کے خدا کا قانون عام ہو رہا ہے اور دنیا کی قومیں (مسلمان ہوئے بغیر) اسلامی قوانین پر عمل پیرا ہوتی جا رہی ہیں۔ بلکہ وہ اسی کو اسلام کے "دین فطرت" ہونے کی ایک دلیل قرار دینگے کہ دیکھو! دنیا نے اسقدر جدوجہد کے بعد غلامی کو مٹایا تھا۔ لیکن چونکہ غلامی "انسانی فطرت" کا تقاضا تھی اس لئے ان قوموں کو دوبارہ اس کی طرف لوٹنا پڑا۔ "خدا" اپنے "دین" کو اس طرح انسانوں سے منواتا ہے! کیسا دلکش ہوگا وہ نظارہ کہ مسلمان، دشمن کی عورتوں سے زیر دستی شب بسر کر رہے ہونگے اور دشمن ان کی بہو بیٹیوں کے ساتھ یہ کچھ کر رہا ہوگا۔ اور مسلمانوں کے ہاں خوشی کے شادیانے بج رہے ہونگے کہ خدا کا دین عام ہو رہا ہے۔ اس وقت ابلیس بوریہ بستر باندھکر اللہ کے ہاں واپس چلا جائیگا کہ اب زمین پر میری ضرورت باقی نہیں رہی۔ میرا مقصد تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔

مودودی صاحب نے لونڈیوں پر بڑا احسان یہ ظاہر فرمایا کہ

> مالک کے تصرف میں آجانے کے بعد ایک عورت اگر صاحب اولاد ہو جائے تو وہ اس خاندان کی ایک فرد بن جاتی ہے اسکو ام ولد کہا جاتا ہے۔ اسکی اولاد جائز اولاد سمجھی جاتی ہے۔ اور اپنے باپ سے شرعی ورثہ پاتی ہے۔ (ص ۳۱۵)

لیکن کسی اور کو شاید معلوم ہو یا نہ ہو نہ ہو، خود مودودی صاحب کو تو یقیناً معلوم ہوگا کہ "ان کی شریعت" نے یہ تدبیر بھی خود ہی بتادی ہے کہ لونڈیوں سے جنسی تعلقات قایم کئے جائیں اور یہ خدشہ بھی نہ رہے کہ ان کے ہاں اولاد پیدا ہو جائیگی۔ سنئے کہ وہ تدبیر کیا ہے؟

کلیجہ تھامئے! لیکن اس تدبیر کے سننے سے پہلے، ہمارے درد بھرے دل کی ایک کراہ سن لیجئے۔ طلوع اسلام پر وہ وقت انتہائی کرب اذیت کا ہوتا ہے جب اسے کوئی ایسی بات درج کرنی پڑ جائے جسے دنیا کے سامنے پیش کرنے سے نگاہیں زمین میں گڑ جائیں، جس سے دوسروں کی نظروں میں اسلام کی سبکی ہو۔ پھر اس سے بھی زیادہ درد و الم کا وقت وہ ہوتا ہے جب اس قسم کی

باتوں کو "حدیث" کہہ کر درج کیا جائے، کیونکہ حدیث سے مراد یہ ہے کہ اس بات کی نسبت ذاتِ رسالتمآبؐ کی طرف کی جاتی ہے۔ حضور ختمی مرتبتؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کا مقام اس قدر بلند ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اسے "خلقِ عظیم" کہہ کر پکارتا ہے اور حضورؐ کے ذکر کو بلند کرنے کا اعلان کرتا ہے (ورفعنالک ذکرک) اس لئے طلوعِ اسلام کے صفحات میں کسی ایسی بات کا درج ہونا جس سے اس ذاتِ گرامی (فداہ ابی وامی) کی شان میں ذرا سا بھی طعن پایا جائے، ہمارے لئے قیامت کا حادثہ ہوتا ہے۔ لیکن ہم کیا کریں کہ بعض وقت صورت ایسی واقعہ ہو جاتی ہے کہ اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں رہتا۔ مثلاً اسی غلامی کے موضوع کو لیجئے۔ اگر ہم اس مقام پر فقط اتنا کہہ کر آگے گذر جائیں کہ ہماری کتبِ روایات میں ایسی ایسی شرمناک باتیں موجود ہیں جن کے تصور سے پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے، تو مُلّا فوراً اعلان کر دیگا کہ "طلوعِ اسلام بکواس کرتا ہے۔ نبی اکرمؐ کی احادیث مقدسہ اور ان میں اس قسم کی باتیں! معاذ اللہ۔ معاذ اللہ۔ اس دریدہ دہن کو شرم نہیں آتی کہ ایسے ایسے اتہامات تراشتا ہے اور پھر انہیں پوری بے حیائی سے حضور رسالتمآبؐ کی طرف منسوب کرتا ہے۔" چونکہ عوام ان کتب روایات کی حدیثوں سے بے خبر ہوتے ہیں اور یہ بات بھی بڑی معقول نظر آتی ہے کہ ایسی مقدس کتابوں میں اس قسم کی بے حیائی کی باتیں نہیں ہو سکتیں، اس لئے مُلّا کا یہ حربہ کارگر ہو جاتا ہے۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ سینے پر پتھر رکھ کر، اس قسم کی مثالیں انہی مقدس کتبِ روایات سے درج کر دیں تاکہ پڑھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ ان میں فی الواقعہ یہ کچھ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طلوعِ اسلام نے مُلّا کے مذہب کی مخالفت ہی اس لئے شروع کر رکھی ہے کہ اس مذہب سے دنیا میں مسلمان رسوا ہو رہے ہیں —— اسلام سخت بدنام ہو رہا ہے۔ اقوامِ عالم میں مسلمانوں کے اسلاف ہدفِ طعن و تشنیع بن رہے ہیں۔ خود حضور رسالتمآبؐ کی اس قسم کی تصویر سامنے آتی ہے جس سے (معاذ اللہ معاذ اللہ) انسان کا خون کھولنے لگ جاتا ہے، اور اس سے بھی آگے، خود خدا کا تصور ایسا قائم ہوتا ہے جو انسان کے دورِ جہالت و بربریت کا پیداوار دکھائی دیتا ہے۔ اگر کبھی طلوعِ اسلام کے صفحات پر اس قسم کی روایات نقل کر دی جاتی ہیں جو قارئین کے ذوقِ لطیف پر گراں گزرتی ہیں تو محض اس لئے کہ ان کے درج کئے بغیر یہ بات کبھی سمجھ میں ہی نہیں آسکتی کہ جس مذہب کو مُلّا اسلام کے نام سے پیش کرتا ہے کیا وہ فی الواقعہ ایسا ہے جیسا طلوعِ اسلام کہتا ہے؟

یہ ہے وہ ضرورت جس کی وجہ سے طلوعِ اسلام کو بعض اوقات اس تلخ اور ناگوار فریضہ کو سر انجام دینا پڑتا ہے۔ مُلّا کہتا ہے کہ طلوعِ اسلام کو اس "گند اُچھالنے" میں مزہ ملتا ہے۔ ہم اس کی آنکھوں میں وہ بینائی کہاں سے لا کر رکھ دیں جس سے وہ دیکھ سکے کہ ہمارا سینہ کتنے کتنے بڑے گہرے زخموں سے چھلنی ہو رہا ہے۔ اگر اسے کہیں اس قسم کی بینائی نصیب ہو جائے تو وہ پھر دیکھ سکے کہ ہم کیا کہتے ہیں اور کیوں ایسا کہتے ہیں۔

زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں — کیا جانئے کیا کہتا، کیا دیکھتا کیا کرتا

اس عرضداشت کو سامنے رکھ کر اب اصل موضوع کی طرف آیئے۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ خود مُلّا کی شریعت نے اس کی بھی تدبیر کر دی ہے

صحیح بخاری کی روایات

کہ لونڈیوں کے ساتھ جنسی تعلقات بھی قائم ہوں اور اولاد کا خطرہ بھی پیدا نہ ہو۔ ہماری طرح چھاتی پر پتھر رکھئے اور سنئے وہ تدبیر! اور اس کے بعد دیوارِ حرم سے ٹکرا کر سر پھوڑ کر مر جائیے۔ "صحیح" بخاری

کتاب البیوع۔ مطبوعہ مصر، جلد دوم صہ۱۸ پر یہ حدیث درج ہے:

"ان اباسعید الخدری اخبرہ انہ بینما ھو جالس عند رسول اللہ۔ قال یارسول اللہ انا نصیب سبیا۔ فنحب الاثمان فکیف تری فی العزل۔ فقال او انکم تفعلون ذالک لا علیکم ان لا تفعلوا ذالکم فانھا لیست نسمۃ کتب اللہ ان تخرج الا ھی خارجۃ"

ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک روز جبکہ رسول اللہؐ کے پاس بیٹھے تھے حضورؐ سے عرض کیا کہ ہم قیدی عورتوں کے ساتھ جماع کرتے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ وہ حاملہ نہ ہوں کیونکہ ہم اُنھیں بیچنا چاہتے ہیں۔ تو عزل[1] کرنے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

آپ نے فرمایا کہ کیا تم ایسا کرتے ہو۔ تم پر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ جو بچہ پیدا ہونا ہے اللہ نے مقرر کیا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گا۔

ذرا سوچا بھی آپ نے کہ یہ نقشہ کس مجلس کا کھینچا گیا ہے؟ صحابہ کبارؓ استفسار کر رہے ہیں اور حضور نبی اکرمؐ جواب دے رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ خود ہی اندازہ فرما لیجئے کہ عجم کے منافقین نے کس کس طریق سے ہمیں تباہ و برباد کیا ہے۔ یہ ہے وہ تصویر جو انھوں نے آپ کے رسولِ مقبول اور ان کے صحابۂ کبار کی کھینچ رکھی ہے۔ اور یہ تصویر آج اُس کتاب میں موجود ہے جسے "مُلّا" قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ کہہ کر پیش کرتا ہے۔ عزل سے متعلق مذکورہ بالا گفتگو محض نظری حیثیت سے نہیں ہو رہی بلکہ اسی بخاری (کتاب النکاح۔ باب العزل۔ جلد سوم صہ۱۶۳) میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ

قال کنا نعزل علی عھد النبی والقران ینزل

ہم عہد نبوی میں عزل کیا کرتے تھے اور قرآن نازل ہوا کرتا تھا۔

یہ تھی وہ تدبیر جو (مُلّا کے مذہب کے مطابق) اس مقصد کے لئے اختیار کی جاتی تھی کہ لونڈیوں کو حمل نہ قرار پا جائے تاکہ اس طرح ان کی قیمت کم نہ ہونے پائے۔

اور اگر اس پر بھی حمل ہو جائے۔ یا وہ پہلے سے حاملہ ہو تو پھر مباشرت کی کیا صورت ہو؟ اس کے لئے اسی بخاری (جلد دوم صہ۱۸) میں یہ حدیث بھی موجود ہے۔

لا بأس ان یصیب من جاریۃ الحامل مادون الفرج

اس میں بھی حرج نہیں کہ اپنی حاملہ لونڈی سے شرمگاہ کے علاوہ دوسری جگہ سے مجامعت کر لی جائے۔

معاذ اللہ! معاذ اللہ!! یہ ہیں وہ "احادیثِ مقدسہ" جنھیں حضورِ ختمی مرتبتؐ کی ذات گرامی اور صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور نہیں شرمایا جاتا کہ کل قیامت کو خدا اور اس کے رسول کے سامنے کیا جواب دینگے۔

اس کے بعد مودودی صاحب فرمائیں گے کہ ان "منکرینِ حدیث" سے جب بات کیجئے یہ "غلاظت سے بھری ہوئی جھاڑو" لیکر سامنے آجاتے ہیں (ترجمان القرآن)۔ ہمیں اس غلاظت سے انکار نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ غلاظت آئی کہاں سے ہے؟ کیا "منکرینِ حدیث"

---

[1] عزل کے معنی ہیں مجامعت کے وقت، رحم کے اندر انزال نہ ہونے دینا۔

اس غلاظت کو اپنے ہاں سے لے آئے ہیں یا یہ غلاظت خود ان "کتب مقدسہ" کے اندر موجود ہے جنھیں آپ حضرات وحیٔ خفی پکار کر سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ آپ ان چیزوں کو غلافوں میں لپیٹ لپیٹ کر رکھتے ہیں اور (اپنے مطلب کے علاوہ) عوام کو کبھی نہیں بتاتے کہ ان میں کیا کچھ ہے۔ اور "منکرینِ حدیث" انھیں کھول کر لوگوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں! اس پر آپ کو غصہ آجاتا ہے۔ اور آنا بھی چاہیئے۔ اس لئے کہ اس سے آپ کی اس "مثلہٗ معہٗ" کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے، جس پر آپ کی دین فروشی کا مدار ہے۔

سخت لب ولہجہ اس مقام پر ہمیں دو لفظ ان حضرات سے کہہ لینے کی بھی اجازت دیجیئے جنھیں یہ شکایت ہوتی ہے کہ بعض اوقات طلوع اسلام کا لب ولہجہ سخت ہو جاتا ہے۔ ہم ان سے صرف اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص وہ باتیں جو اوپر کی روایات میں لکھی ہیں آپ کے والدِ مرحوم کی طرف منسوب کرے۔ یعنی وہ لوگوں سے یہ کہتا پھرے کہ آپ کے والد بزرگوار اپنے بچوں کو اس قسم کی تعلیم دیا کرتے تھے، تو کیا آپ اس شخص کو تبریک وتہنیت کا خط لکھیں گے؟ کیا آپ کا جی یہ نہیں چاہے گا کہ وہ شخص اگر کہیں مل جائے تو اس کی زبان گدی سے کھینچ کر نکال لی جائے! اگر آپ کو اپنے والدِ مرحوم کی شان میں گستاخی کرنے والے کے خلاف اس قدر غصہ آسکتا ہے تو کیا آپ ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دے سکتے کہ جو شخص اس ذاتِ اقدس واعظم کی شانِ اطہر میں اس قدر گستاخی کرے، جو ہمارے نزدیک جملہ کائنات سے زیادہ محبوب وعزیز ہے، ہم اسے اتنا بھی نہ کہہ سکیں کہ تمہیں ان باتوں کو اُس ہستیٔ مقدس کی طرف منسوب کرتے سے شرم آنی چاہیئے؟ اگر کسی کے دل میں رسول اللہؐ کے متعلق اتنی بھی غیرت نہیں ہے تو اس کا ایمان اور اس کے ضوابطِ اخلاق اسے مبارک۔ ہم اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ (نظیری کے الفاظ میں) وہ ـــــ از قبیلۂ ما نیست۔

یہ ہے مختصراً غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق مسلک اس نظامِ شریعت کا جسے محترم مودودی صاحب اور ان کی جماعت، پاکستان میں نافذ کرنے کے لئے سرگرمِ عمل ہیں۔ آپ بھی اس "جہادِ عظیم" میں حصّہ لیجئے اور کوشش کیجئے کہ یہ نظام کم از کم تیسری جنگِ عظیم سے پہلے پہلے نافذ ہو جائے تاکہ جب اس کے بعد جنگ کے قیدیوں کا اہم مسئلہ اقوامِ عالم کے سامنے آئے تو آپ ان اقوام سے کہہ سکیں کہ تم نے آج تک اس پیچیدہ اور دشوار مسئلہ کے حل کرنے کی جس قدر شکلیں اختیار کی ہیں وہ سب اس لئے ناکام رہی ہیں کہ وہ انسانوں کے دماغ کی وضع کردہ تدابیر تھیں۔ اب یہ دیکھو کہ اس مسئلہ کا حل اس نظامِ شریعت میں کیا ہے جسے خود "خدا نے" اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے نازل فرمایا۔ اور وہ حل یہ ہے کہ

> جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں۔ حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے ان کو رہا کر دے۔ چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ ان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے قبضے میں ہوں۔ اور چاہے انھیں سپاہیوں

میں تقسیم کردے۔ ان سپاہیوں کو حق ہوگا کہ وہ ان عورتوں سے، بلا نکاح، بلا ان کی رضامندی اور بلا تعداد جنسی تعلقات قائم کریں۔ انھیں یہ بھی اختیار ہوگا کہ اس خیال سے کہ اگر انھیں حمل رہ گیا تو ان کی قیمت کم ہوجائے گی، مباشرت کے وقت عزل کرلیا کریں۔ اور حمل کی صورت میں شرمگاہ کے علاوہ دوسرے طریق سے (من دون الفرج) مجامعت کرلیا کریں۔ اس کے بعد جب جی چاہے انھیں کسی دوسرے کے ہاتھ [illegible]ت کردیں۔ جو شخص انھیں اس طرح سے خریدے اسے بھی وہی حق استمتال حاصل ہوگا جو فروخت کنندہ کو تھا۔

جب آپ کی "حکومتِ الٰہیہ" کا نمائندہ، مجلس اقوامِ عالم میں اس "آسمانی تدبیر" کا اعلان کرے گا تو ساری دنیا "اسلام" کی عظمت و صداقت کا اعتراف کرے گی اور ہر شخص ایسی "نورانی ہدایت" بھیجنے والے "خدا" کے حضور سجدہ ریز ہوگا اور اس طرح

"زمین اپنے پرورش کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی"!

اس وقت عجمی سازشیوں کی روحیں اس اعلان کرنے والوں پر حمد و ستائش کے پھول برسائیں گی کہ آج تمہارے ہاتھوں ہمارے مقاصد کی تکمیل ہوگئی!

کسقدر بدبخت ہے مسلمانوں کی قوم جو ایسے "جہادِ عظیم" میں ان مصلحین کا ہاتھ نہیں بٹاتی؟

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

کے

چند عنوانات

آنحضرتؐ کا بچپن — اسوۂ محمدیہ پر ایک نظر — گنبدِ خضراء — حضرت ابوذر غفاریؓ۔ حضرت اویس قرنیؓ — مثنوی اسرار خودی — پیام مشرق — جاوید نامہ — ضربِ کلیم اسباب زوالِ امت — خطِ عربی — نابینائی — سفر حج — میری طالب علمی

ضخامت چارسو صفحات — قیمت چار روپے

ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن۔ جلد چہارم)

ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم، اور سیرت صاحبِ قرآن علیہ التحیہ والسّلام، خود قرآن کے آئینہ۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں، اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دوسو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائناتؐ جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں ــــ کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جِلد مضبوط اور حسین، گردپوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔

قیمت بیس۲۰ روپے ــ محصولڈاک ۱۲/

ادارہ طلوعِ اسلام۔ کراچی

(بقیہ لمعات از صفحہ ۱۰)

ہم جانتے ہیں کہ قوم کی حالت ایسی ہو چکی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر نے بھی حیرت سے پوچھا تھا کہ رب ارنی کیف تحیِ الموتی (۲/۲۶۰) "میرے پروردگار! مجھے دکھا تو سہی کہ تو ان مردوں کو کس طرح زندہ کردے گا؟" لیکن ان مردوں میں ہنوز زندگی کی رمق باقی تھی۔ ان میں زندہ ہونے کی صلاحیت موجود تھی۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ کرنے کا کام فقط اتنا ہے کہ ان لوگوں کو جو ذہنی تشتت وانتشار کا شکار ہو چکے ہیں، ایک آواز پر جمع ہونے کی عادت ڈال دو۔ اگر تم نے یہ کر لیا تو تم دیکھو گے کہ اسی مُردوں کی بستی سے کس طرح زندگی کے چشمے ابلنے لگ جاتے ہیں۔ مسلمان بھی اس وقت فکر و نظر کی پریشانی کا شکار ہے۔ اس کے لئے بھی کرنے کا کام یہ ہے کہ اس میں ایک آواز پر جمع ہو جانے کی عادت ڈال دی جائے۔ یہ آواز کسی انسان کی آواز نہیں ہو سکتی۔ یہ آواز خود اللہ کی آواز ہے جو قرآن کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ مسلمانوں کو اسی آواز پر لبیک کہنے کی عادت پڑ جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ طلوعِ اسلام کا مشن صرف اتنا ہے کہ یہ مسلمانوں کے سامنے اس رازِ حیات کو بے نقاب کردے کہ استجیبوا للہ و للرسول اذا دعاکم لما یحییکم (۸/۲۴) اس قرآنی نظام کے مرکزی آواز پر لبیک کہو جو تمہیں اس چیز کی دعوت دیتا ہے جو زندگی عطا کرنے والی ہے۔ یاد رکھئے! استجاب (RESPONSE) ہی زندگی کی نشانی ہے۔ زندہ وہ ہے جو کسی کی آواز کا جواب دیتا ہے۔ خدا چونکہ مستقل حیات ہے اس لئے وہ ہر بلانے والے کی آواز کا جواب دیتا ہے۔ اجیب دعوۃ الداع اذا دعانِ۔ "میں ہر پکارنے والے کی آواز کا جواب دیتا ہوں"۔ اس لئے اس کا مطالبہ بھی یہ ہے کہ فلیستجیبوا لی (۲/۱۸۶) تم میری آواز پر لبیک کہو۔ میرے بلاوے کا جواب دو۔ خدا کی آواز، اس کا بلاوا، قرآن ہے۔ جس دن مسلمان نے قرآن کی آواز کا جواب دینا شروع کر دیا، اسی دن زندگی کی تمام حرارتیں اس کے لئے وجہ گرمیِ محفل بن جائیں گی۔ طلوع اسلام سنتِ ابراہیمیؑ کی اتباع میں اِن آواز فراموش متوحش پرندوں کو آہستہ آہستہ سدھا رہا ہے کہ وہ اس صدائے سرمدی پر لبیک کہنا سیکھ جائیں۔

بہ جلالِ تو کہ در دل دگر آرزو ندارم بجز ایں دعا کہ بخشی بہ کبوتراں عقابی!

جب یہ ہو گیا تو پھر دیکھئے گا کہ وہ معاشرہ کتنی جلدی وجود میں آجاتا ہے جس میں زندگی اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ زمزمہ بار و نغمہ خیز ہوگی اور کوئی فرد اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کریگا۔ اس لئے خودکشی کا لفظ تک ان کی لغت میں باقی نہ رہے گا۔ آپ نے آج تک کہیں سنا کہ عہد رسالتمآب میں کسی شخص نے خودکشی کی ہو؟ وہ معاشرہ تو دنیا کو زندگی بانٹنے کے لئے قائم ہوا تھا۔ اس میں خودکشی کا کیا کام!

شرک

ساری دنیا کے مسلمان خواہ اور ہر بات میں اختلاف رکھتے ہوں لیکن اس ایک بات میں سب یک زبان ہوں گے کہ شرک جرمِ کبیر اور ظلم عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام گناہ بخش دیگا لیکن شرک کبھی نہیں بخشے گا۔

لیکن جب ان سے پوچھیے کہ شرک کسے کہتے ہیں تو ان کا ذہن بت پرستی سے آگے نہیں جائے گا۔ یعنی ان کے نزدیک بتوں کا پوجنا شرک ہے۔ اور چونکہ مسلمان بتوں کو نہیں پوجتے اس لئے ان میں سے شرک کا مرتکب کوئی نہیں ہوتا۔

ان میں کا ایک گروہ ذرا آگے بڑھتا ہے تو قبر پرستی (مردوں سے مرادیں مانگنے) اور ان کے نام پر نذر نیاز دینے کو شرک قرار دیتا ہے اور اس سے مطمئن ہو جاتا ہے کہ شرک دوسرے فرقے کرتے ہیں۔ ہم پکے موحد ہیں۔ (چنانچہ یہ اپنے آپ کو کہتے ہی موحد ہیں)۔

قرآن نے شرک کے بیشمار گوشے گنوائے ہیں۔ اسلئے کہ قرآن، شرفِ انسانیت کا علمبردار ہے اور شرک، انسانیت کی تذلیل ہے۔

لیکن ان تمام گوشوں میں ایک گوشہ ایسا ہے جس کی طرف مسلمانوں کے کسی فرقے کی بھی نگاہ نہیں جاتی اور جو شخص اس گوشے کی طرف توجہ دلاتا ہے ہر فرقے کے اربابِ شریعت اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں۔

شرک کا یہ گوشہ آپ کو سورۃ شوریٰ کی اس آیۂ جلیلہ میں ملیگا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ (۴۲/۲۱)

کیا ان لوگوں نے ایسے شریک مقرر کر رکھے ہیں جو انھیں شریعت کے ایسے احکام متعین کر کے دیتے ہیں جن کا حکم اللہ نے نہیں دیا۔

دیکھئے کہ بات کسقدر صاف اور واضح ہے۔ شریعت کا کوئی ایسا حکم وضع کرنا جس کی اجازت اللہ نے نہ دی ہو، قرآن کی رو سے شرک ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ "اللہ کی اجازت" یا "اللہ کا حکم" قرآن کے اندر ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بات یوں ہوئی کہ شریعت کا کوئی ایسا حکم وضع کرنا۔ یا کسی ایسے حکم کا ماننا جس کی اجازت قرآن سے نہ ملتی ہو، شرک ہے۔ آیت درحقیقت تفسیر ہے اس آیت کی جس میں اللہ نے کہا ہے کہ

وَلَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶)

اللہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

اس لئے مسلمانوں سے کہا گیا کہ

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَىْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (۴۲/۱۰)

اور جس بات میں بھی تم اختلاف کرو تو (اس کا فیصلہ) اللہ ہی کے حکم کے مطابق ہونا چاہیئے۔

اب ان کڑیوں کو ملائیے۔ بات صاف ہو جائیگی۔

(۱) جس معاملے میں اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ کے حکم کے مطابق ہوگا۔

(۲) صرف اللہ کے حکم کے مطابق۔ اس لئے کہ اللہ اپنے حکم میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔

(۳) جو لوگ شریعت کے ایسے احکام دیتے ہیں جن کا حکم اللہ نے نہیں دیا تو وہ اللہ کے شریک ہیں۔ ایسے احکام کی اطاعت شرک ہے۔

اس کے بعد دیکھئے کہ کتنے ایسے احکام ہیں جنھیں احکامِ شریعت کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے لیکن وہ اللہ کے حکم کے یکسر خلاف جاتے ہیں۔ آپ اس قسم کے کئی احکام طلوعِ اسلام کے صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔

مثلاً

(الف) اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ دین کے معاملے میں کسی پر کوئی جبر نہیں۔ لیکن ملا کی شریعت کہتی ہے کہ دین بدلنے والے مسلمان کو قتل کر دیا جائے گا۔

(ب) خدا کہتا ہے کہ غلامی جرم عظیم ہے۔ جنگ کے قیدیوں کو یا فدیہ لیکر چھوڑ دو۔ یا احساناً رہا کر دو۔

ملا کی شریعت کہتی ہے کہ جنگ کے قیدیوں میں سے مردوں کو غلام بناؤ اور ان کی عورتوں کو بلا حد و نہایت (جتنی جی چاہے) لونڈیاں بنا کر رکھو۔ ان سے بلا نکاح جنسی تعلقات قائم کرو اور جب جی چاہے دوسرے کے پاس فروخت کر دو۔

(ج) خدا کہتا ہے کہ یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے حصہ دو لیکن ملا کی شریعت کہتی ہے کہ یتیم پوتے کو وراثت سے محروم رکھو۔

(د) خدا کہتا ہے کہ تمہیں تمہارے مال میں حقِ وصیت حاصل ہے۔ ملا کی شریعت کہتی ہے کہ نہیں! یہ حق صرف ایک تہائی مال میں ہو سکتا ہے۔ اور وہ بھی غیر وارثین کے لئے۔

(س) خدا کہتا ہے کہ ہم نے صرف چار چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ ملا کی شریعت حرام و حلال کی ایسی لمبی لمبی فہرستیں پیش کرتی ہے کہ عقل دنگ رہ جائے۔

یہ تو بطور مثال چند فقہی احکام کا ذکر ہے۔ ملا تو اس سے بھی آگے بڑھتا ہے۔

خدا کہتا ہے کہ میرے احکام کا مجموعہ قرآن ہے جس میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا اور اس کی مثل و نظیر ناممکن ہے۔ ملا کہتا ہے کہ قرآن کے ساتھ قرآن جیسا (مثلہ معہ) مجموعۂ احکام شریعت اور بھی ہے۔ نہ صرف قرآن کی مانند بلکہ وہ قرآن کے احکام کو منسوخ بھی کر سکتا ہے۔

ان چند مثالوں کو سامنے رکھئے اور پھر ایک مرتبہ اور دیکھئے سورۂ شوریٰ کی اس آیت کو

اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا لَمۡ يَاۡذَنۡۢ بِهِ اللّٰهُ ۔ (۴۲/۲۱)

کیا ان لوگوں نے ایسے شریک مقرر کر رکھے ہیں جو انھیں شریعت کے ایسے احکام متعین کر کے دیتے ہیں جن کا حکم اللہ نے نہیں دیا۔

اور اس کے بعد

اے مسلماں! پوچھ اپنے دل سے، ملا سے نہ پوچھ

کہ ان احکام کو شریعت کے احکام سمجھنا۔ اور ان کی اتباع کرنا، توحید ہے یا شرک!

یہ مت دیکھو کہ ہم کیا کہتے ہیں۔ یہ بھی نہ دیکھو کہ مُلا کیا کہتا ہے۔ لیکن اتنا تو دیکھو کہ جس خدا پر تمہارا ایمان ہے، وہ کیا کہتا ہے!

کیا تمہارا ایمان نہیں کہ ـــــ شرک، ظلم عظیم ہے!

کیا تمہارا ایمان نہیں کہ ـــــ خدا شرک کو کبھی معاف نہیں کرے گا؟

اگر اس پر تمہارا ایمان ہے تو پھر سوچو کہ جس چیز کو خود خدا شرک قرار دے رہا ہے، اس کے اختیار کرنے سے تم کبھی توحید پرست ہو سکتے ہو؟

اگر یہ بات تمہاری سمجھ میں آسکتی ہے تو پھر خود ہی فیصلہ کرو کہ اس قسم کی غیر خدائی شریعت کی اتباع کے بعد تم خدا کو کیا جواب دو گے، ملا کے ساتھ کیا بیتے گی؟ اسے چھوڑو۔ سوچو یہ کہ اللہ کے حضور خود تمہارے ساتھ کیا بیتے گی؟ وہاں تو تمہیں ہی جواب دینا ہوگا۔ تم یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکو گے کہ ہمیں مُلا نے ایسا ہی بتایا تھا۔ پوچھا یہ جائے گا کہ جس قرآن کو ہم نے تمہارے لئے ختمِ رسالت[1] کے بعد حجت (دلیل محکم) بنا کر محفوظ رکھا تھا، وہ قرآن بھی تمہارے پاس موجود تھا یا نہیں! یاد رکھو! اس وقت ان منکرینِ قرآن میں سے کوئی بھی تمہاری سفارش نہیں کر سکے گا!

طلوع اسلام آپ کو صرف اس شرک سے بچنے کی دعوت دیتا ہے۔ مُلا کے پاس اس دعوت کا جواب گالیوں کے سوا کچھ نہیں۔ اسلئے کہ خود خدا کا ارشاد ہے کہ جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے لا برھان لہٗ بہ (۲۳/۱۱۷) اس کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ اور جس کے پاس دلیل نہ ہو وہ گالیاں دینے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے!

---

[1] لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل (۴/۱۶۵)
تاکہ یہ (قرآن) رسولوں کے بعد انسانوں کیلئے اللہ کی طرف سے حجت کا کام دے۔

مساجد کے خطیب

صرف ایک روپیہ میں

طلوعِ اسلام حاصل کر سکتے ہیں

ایک صاحب نے پیشکش کی ہے کہ جو مساجد کے خطیب ایک روپیہ بھیجدیں گے ان کا بقایا چندہ وہ خود ادا کر کے طلوع اسلام ایک سال کے لئے ان کے نام جاری کرا دیں گے۔ لہٰذا جو حضرات طلوع اسلام حاصل کرنا چاہیں وہ جلد از جلد ایک روپیہ ارسال کر دیں۔ چونکہ پیشکش محدود ہے اس لئے جس ترتیب سے منی آرڈر موصول ہوں گے اسی ترتیب سے رسالے بھیجے جائیں گے۔

ناظم طلوع اسلام

(دین پریس کراچی)

نوحۂ انگلیس

آہ، آبادانِ آبادان نماند
آہ، ایں جا جائے اُستاداں نماند
چشمِ من روشن، دلم شاداں نماند

دل پریشاں خانہ ویراں می روم
می روم از خاکِ ایراں می روم

ایں زمیں از آتشِ ملّی بتفت
نفت وہم ماشینِ من از دست رفت
وائے نفت، اے وائے نفت، اے وائے نفت

در فراقِ نفت گریاں می روم
می روم از خاکِ ایراں می روم

چوں حقِ ایرانیاں تحقیق شد
از مصدّق صدقِ شاں تصدیق شد
ملّتِ من سخت بے توفیق شد

خود ز دستِ خویش نالاں می روم
می روم از خاکِ ایراں می روم

من ز ایراں نفع ہا اندوختم
وندریں خاک آتشے افروختم
وائے ناکامی کہ خود ہم سوختم
زیں سبب بے ساز و ساماں می روم
می روم از خاکِ ایراں می روم

من بہ عذر جستجوئے علم و فن
بُردم ایراں را سوئے عصرِ کہن
تازہ کردم جذبۂ قوم و وطن
برق زن بر دین و ایماں می روم
می روم از خاکِ ایراں می روم

ریختم در مُلک طرحِ انقلاب
دخترانش را نمودم بے حجاب
کردمش بیگانہ از علمِ کتاب
بر فتوحِ خویش نازاں می روم
می روم از خاکِ ایراں می روم

آہ اگر ایراں دِگر ایراں شود
بے قرار از جذبۂ ایماں شود
بہرہ مند از حکمتِ قرآں شود
من ازیں اندیشہ لرزاں می روم
می روم از خاکِ ایراں می روم

اسد ملتانی

نقد و نظر

۱۔ حلال و حرام کی تحقیق

مرتبہ سید محمد صبیح ایڈوکیٹ، دارالاشاعت قرآن، ٹھٹہ ضخامت ۹۶ صفحات معمولی کاغذ قیمت ۸/

سید محمد صبیح صاحب نے اس رسالے میں بتایا ہے کہ قرآن کی رُو سے صرف مردار، بہتا خون، لحم خنزیر اور غیر اللہ کے نام کی طرف منسوب چیزیں حرام ہیں۔ ان کے علاوہ اور کچھ حرام نہیں۔

یہ قرآن کا واضح فیصلہ ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ ہمارے مروجہ اسلام میں حرام وحلال کی جو طولانی فہرستیں ہیں وہ سب انسانوں کی خود ساختہ ہیں اور کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی شے کو حرام قرار دیدے۔ یہ حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔

اس رسالہ میں ایک مقام البتہ ایسا ہے جو ذرا کھٹکتا ہے۔ اس میں پانچواں سوال حسب ذیل ہے۔

> مان لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے غذا میں ہم پر حرام کیا ہے صرف مردار، بہتا لہو، لحم خنزیر اور جو غیر اللہ کے نام زد کیا جائے۔ تو بقیہ جانوروں کو ہم حرام نہ کہیں مگر ان کے گوشت کھانے سے پرہیز یا انکار کریں تو کیا حرج ہے۔

مرتب نے اس سوال کا جواب صاف صاف الفاظ میں تو نہیں دیا لیکن ان کے انداز سے مترشح ہوتا ہے (اور اس کی تائید رسالہ کے دیگر مقامات سے بھی ہوتی ہے) کہ ان کے نزدیک کسی حلال شے کے کھانے سے انکار کر دینا، خدا کے حکم کی معصیت ہے۔ ہمارے خیال میں یہ رویہ متشددانہ ہے۔ قرآن نے متذکرہ صدر چار چیزوں کو روک دیا ہے کہ انھیں نہیں کھایا جائے گا۔ باقی چیزوں کو کھلا چھوڑ دیا ہے (حلال) کہ ان کے کھانے کی ممانعت نہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر حلال شے کا کھانا فرض ہے۔ یا کسی حلال شے کے کھانے سے انکار کر دینا، معصیتِ خداوندی ہے۔ حلال شے کے متعلق یہ کہنا کہ وہ حرام ہے، بیشک خدا کے حکم کے خلاف بغاوت ہے (جس طرح حرام شے کے متعلق کہدینا کہ وہ حلال ہے، ضابطۂ خداوندی کے خلاف سرکشی ہے)۔ لیکن اگر کسی حلال شے کے کھانے کو انسان کا جی نہیں چاہتا۔ وہ اسے مرغوب اور خوشگوار نہیں (اسے طیب کہتے ہیں) تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے حکم خداوندی سے سرکشی برتی ہے۔ یہی اصول شادی کے معاملے میں ہے۔ اللہ نے بعض عورتوں سے نکاح حرام قرار دیا ہے۔ باقی عورتوں کو حلال ٹھہرایا ہے۔ ان حلال عورتوں کے متعلق اجازت ہے کہ فانکحوا ما طاب لکم من النساء۔ ان میں جو تمہیں پسند ہو اس سے نکاح کرو۔ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ جو شے حلال ہے اسے کھانا ہی پڑے گا خواہ اسے طبیعت پسند کرے یا نہ کرے۔ تو اس سے عجیب مصیبت پیدا ہو جائیگی۔

ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں ان میں سے طبیعت کی رغبت اور پسند کے مطابق کھانی چاہئیں۔

البتہ جن چیزوں سے رغبت نہ ہو انھیں اپنے اوپر حرام نہیں قرار دے لینا چاہئے۔ (اس وقت تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اسلئے انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جب حرام و حلال کے متعلق کبھی تفصیل سے لکھنے کا موقع آئیگا تو ان اجمالی اشارات کی تفصیل بھی بیان کر دی جائے گی اور ان آیات کا صحیح مفہوم بھی پیش کر دیا جائے گا جن سے صبیح صاحب نے یہ سمجھا ہے کہ حلال شے کے کھانے سے انکار کر دینے سے معصیتِ خداوندی لازم آجاتی ہے)۔ بہرحال، ہمیں یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ صبیح صاحب دین کے معاملے میں سند اور حجت صرف قرآن کو سمجھتے ہیں۔ وذالك الدين القيم ولكن اكثر الناس لا يعلمون۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذوقِ قرآن میں برکات عطا فرمائے۔

۲۔ مقالاتِ صارم

جناب عبدالصمد صاحب صارم۔ استاذ عربی و فارسی۔ اورنٹیل کالج لاہور، کے متفرق مضامین کا مجموعہ جو مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مضامین مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ مثلاً قدیم اسلامی نظریۂ تعلیم، خوارج، قید خانے اور سزائیں، عورت، جمعِ قرآن، اور ان کے ساتھ، چیونٹیاں اور سل بھی۔ کچھ مضامین اوریجنل ہیں، کچھ تلخیص و تراجم۔ مضامین عمومی سطح کے ہیں۔ (اس لئے تفصیلی تبصرہ کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش) ضخامت ۱۷۵ صفحات۔ کتابت، طباعت، کاغذ معمولی۔ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ اور مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ۔ ادارۂ علمیہ۔ دھنی رام روڈ۔ نئی انارکلی۔ لاہور۔

۳۔ کلیاتِ اکبر جلد دوم و سوم
۴۔ اکبر اس دور میں۔

بزمِ اکبر، کراچی کی طرف سے، یہ دو مزید کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ کلیاتِ اکبر حصہ اول پر اس سے پہلے طلوعِ اسلام میں تبصرہ ہو چکا ہے جس میں ہم کلامِ اکبر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ لہٰذا کلیات کے ان حصوں کے متعلق کسی مزید رائے کی ضرورت نہیں۔

"اکبر اس دور میں" جناب اختر انصاری صاحب کی ترتیب دادہ ہے۔ یہ مجموعہ ہے ان مضامین کا جنھیں مختلف حضرات نے اکبر اور ان کی شاعری کے متعلق لکھا ہے۔ آپ کو ان حضرات کی آراء سے اتفاق ہو یا اختلاف، یہ الگ بات ہے، لیکن کتاب مرتب کی گئی ہے سلیقے سے۔

دونوں کتابیں، حسنِ صوری کے اعتبار سے بزمِ اکبر کے حسنِ ذوق کی آئینہ دار۔ کلیات، ۲۷۳ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت ہے سات روپے۔ دوسری کتاب کی ضخامت ۳۶۳ صفحات ہے اور قیمت ہے پانچ روپے۔ دونوں مجلد اور مطلا ہیں۔ ملنے کا پتہ۔ بزمِ اکبر، کراچی

FIRDAUS TRADING CORPORATION

Clearing & Forwarding Agents

&

Cotton Merchants

★

SERAI ROAD,
KARACHI.

فردوس ٹریڈنگ کارپوریشن

کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنٹس اینڈ کاٹن مرچنٹس

سرائے روڈ کراچی

Regd. No. S. 1089.

Bengal Oil Mills Ltd.

provides for:

Both

INTERNAL & EXTERNAL CLEANLINESS BY PRODUCING

Highly Vitaminised & Nutritive Cooking Oil

High Class Washing Soap which Cleanses Clothes 'Milky White'

BENGAL OIL MILLS LTD

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by QUAID-E-AZAM)

Telegrams : " BENGALI "

P. O. BOX No. 162
KARACHI-2

Telephone | Office : 3336
Mills : 2008

Only Title Printed at Abbasi Litho Art Press, Frere Road, Karachi and Text Printed at Adbi Press, Robson Road, Karachi, published by Khurshid Alam & issued from Tolu-e-Islam Office, Robeson Road Karachi.